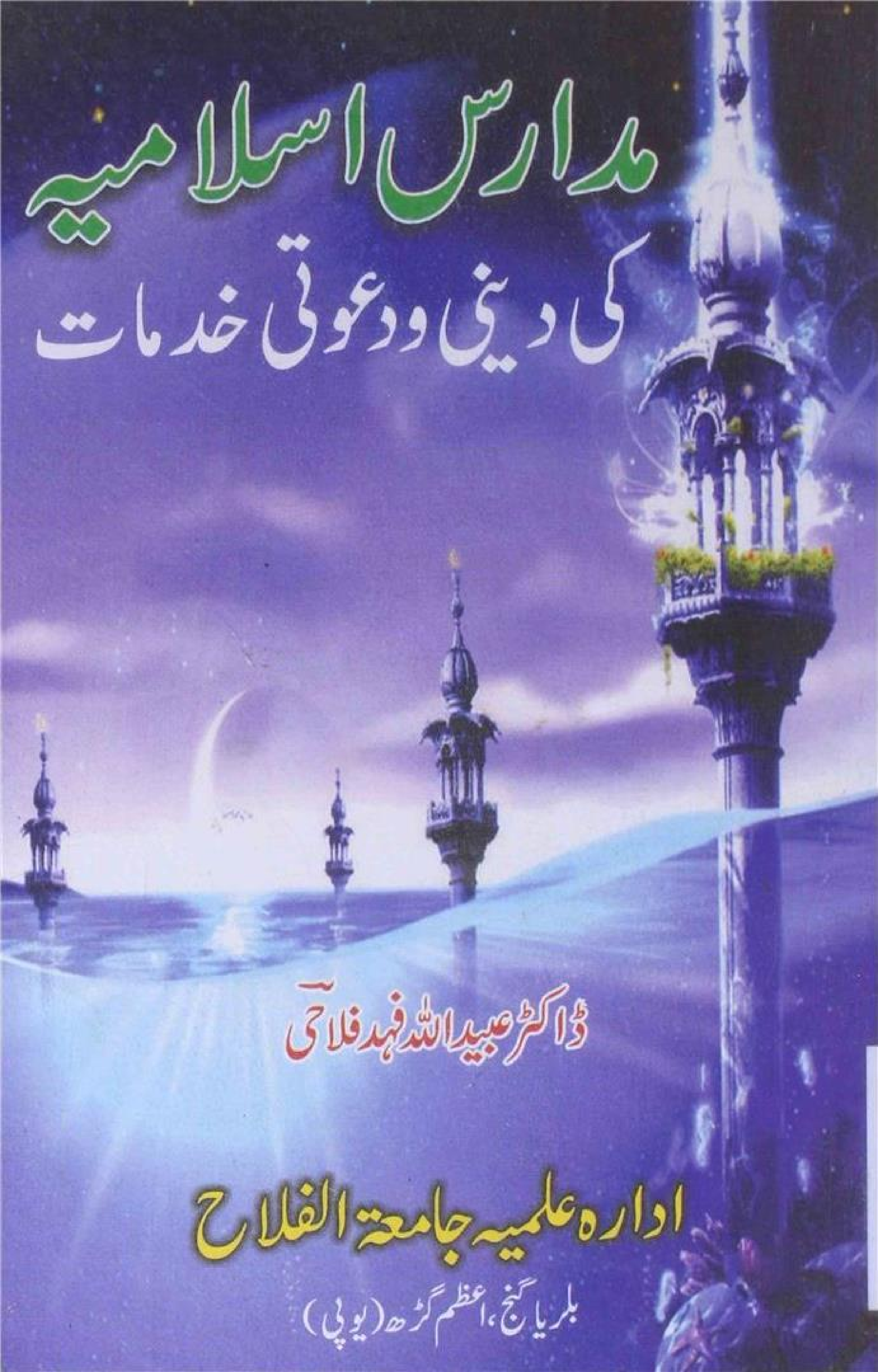


مدارس اسلامیہ

کی دینی ودعوتی خدمات

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح

بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی)

مدارس اسلامیہ
کی
دینی ودعوتی خدمات

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ناشر

ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح

بلریاگنج، اعظم گڑھ (یوپی) انڈیا۔ 276121

©جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : مدارس اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات

مصنف : ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ناشر : ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح
بلریا گنج، اعظم گڑھ، (یوپی) 276121

ملنے کے دیگر پتے : مدھر سندیش سنگم
E-20، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025
فون : 011-26953327, 09212567559
ای میل : madhursandeshsangam@yahoo.co.in

(2) : ایم ۔ ایم ۔ آئی ۔ پبلشرز
ڈی ۔ 307، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025

سن اشاعت : 2010ء
تعداد : 1000
قیمت : -/70

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ، نئی دہلی

فہرست موضوعات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

پیش نظر کتاب ''مدارس اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات'' دراصل اس طویل بحث کی توسیع ہے جو ۲۵۔۲۷ فروری ۲۰۰۵ء کو جامعۃ الفلاح کے بین الاقوامی مذاکرہ میں راقم نے پیش کی تھی۔ مذاکرہ میں جو سوالات اٹھائے گئے اور فاضل شرکاء نے اس پر جو تبصرے کئے انھیں بھی مناسب حذف واضافہ کے بعد اس میں سمولیا گیا اس طرح زیر نظر موضوع پر ایک کتاب وجود میں آ گئی۔

مذاکرہ کا موضوع تھا ''دعوت اسلامی اور مدارس دینیہ'' موضوع بلاشبہ بڑا اہم اور منفرد تھا، بقول پروفیسر محسن عثمانی ندوی ہندوستان کی تاریخ میں مدارس کی خدمات کا دعوتی جائزہ پیش کرنے کی یہ اولین کوشش تھی جو بڑی مسعود ومحمود تھی۔ خاص طور سے ہندو برادران وطن کے اندر دین کی دعوت کا کام اور اس میں مدارس کا حصہ ابھی تک زیر بحث نہ آسکا تھا جبکہ اسی کاز پر ملت اسلامیہ کی بقاو استحکام اور باوقار حیات منحصر ہے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں جو لٹریچر دستیاب ہے ناقص اور ناکافی ہے۔ جامعۃ الفلاح نے مذاکرہ کے موقع پر ایک علمی سوینیر بھی جاری کیا جسے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے ترتیب دیا تھا مولانا انیس احمد فلاحی مدنی نے زیر بحث موضوع پر بعض اہم مضامین اس میں شامل کئے تھے۔

راقم نے اس بحث میں ہندوستان کے بعض نمائندہ مدارس ہی کا تذکرہ کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، جامعہ سلفیہ بنارس، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ، دارالحدیث رحمانیہ دہلی اور جامعہ دارالسلام عمرآباد اور یہ ذکر بھی سرسری ہے اور دعوتی ودینی خدمات کے تناظر میں محدود ہے۔ ہر مکتب فکر کے متعدد ادارے ایسے ہیں جو ہندوستان میں ممتاز اور اپنی خدمات کے اعتبار سے منفرد بھی ہیں جیسے کیرالہ میں سنی مدارس جو ادارہ الثقافۃ السنیۃ کے تحت چل رہے ہیں۔ سلفی مدارس میں مدرسہ ریاض العلوم دہلی، مرکز ابوالکلام آزاد للتوعیۃ الاسلامیۃ کے تحت جامعہ اسلامیہ سنابل

نئی دہلی، جامعہ ابن تیمیہ چمپارن، دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، ندوۃ العلماء کے طرز ومنہج کو اختیار کرنے والے جامعۃ الہدایہ جے پور راجستھان، جامعۃ الفلاح سے ملحق جامعۃ الصالحات بانسی، اور تعلیم نسواں کے میدان میں ملک کا ممتاز ترین مدرسہ جامعۃ الصالحات رامپور وغیرہ۔ مگر صفحات کی تنگی، وقت کی محدودیت اور مکتب فکر کی یکسانیت نے ان مدارس وجامعات کے جائزے سے محروم رکھا۔ بلاشبہ اس میں حق تلفی وناانصافی کے شکوہ کی کافی گنجائش ہے اور راقم کو معذرت پیش کرنے میں کوئی تکلیف بھی نہیں ہے۔ بشرط فرصت آئندہ ان مدارس کی خدمات اور کردار سے بحث کی جائے گی ان شاء اللہ۔ کہ مدارس کی تاریخ مرتب کرنے کی یہ کوئی کاوش نہیں ہے بلکہ نمائندہ مکاتب فکر کے بعض مدارس کے رجحانات کا ہلکا تجزیہ ہے اور بس۔

اس دعوتی ودینی تجزیہ میں شیعہ مکتب فکر کی ترجمانی نہیں ہوسکی ہے۔ میں نے علی گڑھ میں مقیم بعض شیعہ علماء سے مراجعت کی۔ ڈاکٹر سید فرمان حسین اور دوسرے اکابر واصاغر سے مشورہ کیا مگر مطلوبہ مواد فراہم نہ ہوسکا اس لئے سرِ دست ان جامعات کا تذکرہ نہیں ہوسکا جس پر افسوس ہے۔

کتاب کا موضوع دعوتی ودینی خدمات کے مثبت تعارف اور تجزیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں عام طور پر کسی تنقید سے اجتناب کیا گیا ہے کہ یہ فریضہ دوسرے علماء اور دانش ور ادا کر رہے ہیں۔ انداز بیان معروضی اور اسلوب سنجیدہ ہے۔ باوقار طریقے سے تمام مکاتب فکر کے قرار واقعی عطیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہاں ''حاصل کلام'' میں کچھ شکوے ہیں، حکایتیں ہیں، اپنوں سے التماس ہے۔ خود احتسابی کی دعوت ہے۔ اپنے اوپر کچھ عرض ومعروض ہے اور وہ بھی اس لئے کہ راقم کو امیدیں کافی ہیں، اصلاح حال کے امکانات بہت نظر آتے ہیں اور بدلتے منظر نامہ میں اعتراف وقبول اور احتساب وارتقا کا عمل شروع ہوگیا ہے۔ کیونکہ یہ زندہ ومتحرک امت ہے۔ آئینِ نو سے ڈرنے والی اور طرز کہن پر اڑنے والی قوم نہیں ہے۔ تبدیلی، پیش قدمی، اقدام وعمل ایمان واحتساب اس کی بنیادی صفات ہیں۔ یہ تاریخ کے ہر دور میں تغیر وارتقا کے ناگزیر مراحل سے کامیابی کے ساتھ گذرتی آئی ہے۔

میں مشکور ہوں علمی مذاکرہ کے ذمہ داران بطور خاص مولانا مقبول احمد فلاحی مدظلہ کا جنھوں نے ایک اہم موضوع پر زحمت سخن دی، مولانا محمد طاہر مدنی دامت برکاتہم کا کہ اسے کتابی

شکل میں شائع کرنے میں دلچسپی دکھائی، عالی مرتبت حضرت مولانا سید جلال الدین عمری صدر ادارہ علمیہ کا کہ اس کتاب کی اشاعت کی باقاعدہ منظوری عطا کی اور بزرگ کرم فرما حضرت مولانا ابوالبقاء ندوی ناظم اعلیٰ جامعۃ الفلاح کا کہ آپ کی سرپرستی حاصل رہی، جناب محترم کبیر احمد خاں پروفیشنل اسسٹنٹ لائبریری انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کہ موضوع سے متعلق لوازمہ کی فراہمی میں بڑی امداد کی برادر عزیز مولانا اشہد جمال ندوی (سینیر سیکنڈری اسکول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا جنھوں نے بعض معلومات فراہم کیں۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے محض اپنی توفیق سے راقم کو اس کی بے بضاعتی کے باوجود یہ تحریر رقم کرنے کی سعادت بخشی۔ اگر یہ مفید مطلب ہے تو وہ اسے قبول فرمائے اور اگر معاملہ برعکس ہے تو اس کے شر سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

قصر فہد، یونیورسٹی فورٹ انکلیو
بدولی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

عبیداللہ فہد فلاحی
۲۴ر مارچ ۲۰۰۶ء

Email: drfahadamu@ yahoo.com

xxxxxxxxxxxxxx

تنظیم مدارس کی عالمی تاریخ

تشکیل مدرسہ کا آغاز:

مدرسہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں تعلیم گاہ۔ اس کی جمع مدارس ہے۔ عام اصطلاحی معنوں میں دین کی اعلیٰ درسگاہوں کے لئے یہ لفظ مستعمل ہے۔ دسویں اور گیارہویں صدی میں مدرسہ بنیادی طور پر فقہ اور علوم اسلامیہ کی تدریس کے لئے مخصوص تھا جس میں ادبی و علمی مضامین اور علوم معقولات کی حیثیت ثانوی تھی۔ اسلامی تاریخ میں ''مکتب'' اور ''کتاب'' کی اصطلاحیں ابتدائی تعلیم اور اطفال کی تدریس کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ آج کل عالم عرب میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں مدرسہ کا لفظ عام طور سے حفظ و تجوید قرآن کے لئے بولا جاتا ہے۔ اعلیٰ دینی درسگاہوں کے لئے عام طور سے ''جامعہ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

مدرسہ کی تاریخ مسجد سے شروع ہوتی ہے۔ دور رسالت میں مسجد ہی اصل درسگاہ تھی جہاں علم کے پروانے شمع رسالت کے گرد طواف کرتے تھے۔ بعد میں آگے چل کر جامع مسجد علوم وفنون کا مرکز بنتی گئی اور اس کے علمی حلقے عالم اسلام میں بڑے معروف و معتبر ہوئے۔ عربی زبان میں دار، بیت، خزانہ اور مکتبہ کی اصطلاحیں عام طور پر لائبریری کے لئے وقف کی گئیں۔ عالم اسلام میں مدرسہ کی متوازی دوسری اصطلاحیں بھی رائج ہوئیں۔ جیسے رُباط، خانقاہ، زاویہ، تربت، دائرہ اور دُویرہ وغیرہ۔ عہد وسطیٰ کی اسلامی تاریخ میں ان تمام اصطلاحوں کا استعمال ملتا ہے مگر جو شہرت و مقبولیت اور رواجِ عام لفظ مدرسہ کو حاصل ہوا وہ کسی دوسری اصطلاح کے حصہ میں نہ آسکا۔

ابتدا میں مسجد ہی تعلیم گاہ اور مدرسہ کا کام کرتی رہی لیکن بعد کے ادوار میں مدرسہ کی علیحدہ عمارتیں تعمیر ہونے لگیں اور طلبہ و اساتذہ کی اقامت کا بھی انتظام کیا جانے لگا۔ اوقاف کے ذریعے

ان کے مصارف کا بندوبست ہوا اور مسلمان امیروں اور رؤساء کے عطیات اور حکومت وقت کی کفالت اور سرپرستی نے ان کے مالی وانتظامی مسائل حل کیئے۔ عباسی دور میں تعلیم مساجد کے صحن میں، خانقاہوں کے حجروں میں اور علماء کے معمولی مکانوں اور امراء کی حویلیوں میں جاری رہی۔ مدینہ طیبہ کے علاوہ کوفہ، بصرہ اور فسطاط مشہور علمی مراکز تھے۔ اس عہد کی دو درس گاہیں خاص طور سے ممتاز تھیں۔ ایک کوفہ میں امام ابوحنیفہؒ کی درس گاہ اور دوسری مدینہ میں امام مالکؒ کی درس گاہ۔

۳۵۹ھ/۹۷۰ء میں فاطمی جرنیل جوہر الکاتب الصقلی نے جامع ازہر کی بنیاد رکھی۔ فاطمیوں نے اس کو مزید وسعت دی۔ اس درسگاہ میں شیعی علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہاں فاطمی شیعہ داعی تیار کئے جاتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب مصر کو فتح کیا تو جامع ازہر کو اہل السنۃ والجماعت کے علوم وفنون کی تدریس کا مرکز بنادیا۔ ۳۹۵ھ میں فاطمی حکمران الحاکم بأمراللہ نے قاہرہ میں دارالعلم یا دارالحکمۃ قائم کیا جس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا۔ اس کا مقصد شیعی علوم کی اشاعت تھا۔ اس کے مصارف کے لئے فسطاط کے بہت سے مکانات وقف تھے۔

مدرسہ کا علیحدہ انصرام:

کہا جاتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مدارس کے لئے علیحدہ اور مستقل عمارت بنانے کی ابتدا ہوئی۔ دنیائے اسلام میں مدرسہ کی پہلی عمارت نیشاپور میں بنائی گئی۔ یہاں پہلا مدرسہ نیشاپور کے سامانی حکمران ناصرالدولہ ابوالحسن (۳۷۸ھ) نے امام ابوبکر محمد بن حسین بن فورک م ۴۰۶ھ کیلئے بنایا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے متھرا کی فتح سے واپس جاکر تقریباً ۴۱۰ھ میں ایک عالیشان مدرسہ بنوایا۔ اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا۔ مدرسہ کے مصارف کے لئے بہت سے دیہات اور مواضعات وقف کئے گئے تھے۔ سلطان کے بھائی امیر نصر سبکتگین نے اپنی امارتِ نیشاپور کے زمانے میں بھی ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ چوتھا مدرسہ نیشاپور میں امام ابواسحاق اسفرائنی (م ۴۱۸ھ) کیلئے بنایا تھا۔ امام موصوف کلام اور عقلیات کے ماہروں میں سے تھے۔ نظام الملک طوسی نے اپنی وزارت کے بعد نیشاپور میں ایک مدرسہ امام الحرمین الجوینی (م ۴۷۸ھ) کے لئے تعمیر کرایا تھا جو مدرسہ نظامیہ کہلاتا تھا۔

نظام الملک طوسی کی خدمات:

عہد سلاجقہ اس اعتبار سے بہت ممتاز ہے کہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے دور میں ان کے مدبر وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے کاشغر سے لیکر بیت المقدس تک کے سارے علاقوں میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ اور اپنی کل جاگیر کا دسواں حصہ مدرسوں کے لئے وقف کر دیا۔ اس کا عظیم الشان کارنامہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی تعمیر تھا۔ ۴۵۷ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ ۴۵۹ھ میں اس کا افتتاح ہوا۔ نظامیہ کا فیض تین صدیوں تک جاری رہا۔ شیخ سعدی شیرازی اس کے آخری زمانے کے طالب علم تھے۔ ابو اسحٰق شیرازی، امام غزالی، ابو عبداللہ طبری، الخطیب التبریزی، بہاء الدین شداد وغیرہ وقتاً فوقتاً اس میں صدر رہ چکے تھے۔ اس کے احاطہ میں ایک کتب خانہ بھی تھا۔ طلبہ کے لئے وظیفے مقرر تھے۔ نظام الملک نے عام مدرسوں کے علاوہ نیشاپور، ہرات، اصفہان اور موصل میں جو بڑے بڑے مدارس قائم کئے تھے وہ بھی نظامیہ کہلاتے تھے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد کے بعد دوسرا بڑا مدرسہ مستنصریہ تھا جس کی تاسیس ۶۲۵ھ میں خلیفہ مستنصر باللہ نے کی تھی۔

نور الدین زنگی:

نور الدین محمود زنگی (م ۵۶۹ھ) سلطنتِ نوریہ کا بانی، مصر و شام کا فرمانروا، حلب، حماۃ، حمص اور بعلبک میں بڑے بڑے مدارس کا مؤسّس تھا۔ اس کی عظمت اور افتخار کے لئے یہی کافی ہے کہ اس نے دمشق میں دار الحدیث تعمیر کرایا جو اسلامی دنیا میں پہلا دار الحدیث تھا۔ دمشق میں اٹھارہ دار الحدیث تھے لیکن ان میں ممتاز دار الحدیث نوریہ تھا۔ ابن عساکر اس کے شیخ الحدیث تھے۔ دوسرا بڑا مدرسہ عادلیہ تھا جو دمشق کے شافعی مدارس میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے مدرسین میں ابن خلکان، جلال الدین القزوینی اور ابن مالک النحوی شامل تھے۔

ہندوستان میں مدرسہ نظام:

برصغیر میں ترک پٹھان اور مغل چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں داخل ہونا شروع ہوئے مگر ان سے صدیوں پیشتر عرب تاجر سندھ اور مالابار سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل کر علم و ادب کی قندیلیں روشن کر چکے تھے۔ غوری خاندان (۵۴۴-۶۰۲ھ) خاندان غلامان (۶۰۲-۶۸۶ھ) خلجی خاندان (۶۸۹-۷۲۰ھ)

خاندان تغلق (۷۲۰۔۸۱۷ھ) سب علم پرور، علم دوست، علماء کے قدرداں اور مدارس و مکاتب کے سرپرست تھے۔ بہمنی سلطنت (۷۴۷۔۹۲۶ھ) جونپور کے شاہانِ مشرقی (۷۹۴۔۸۷۷ھ) سلاطینِ گجرات (۸۱۰۔ ۹۹۲ھ) سلاطین مغلیہ (۹۳۲ھ/ ۱۲۷۵۔ ۱۵۲۶م/ ۱۸۵۷ء) سب نے ملک کے طول وعرض میں مدارس و مکاتب قائم کیے۔ طلبہ اور علماء کو خزانہ شاہی سے وظائف دیئے جو اصطلاح میں ''مدد معاش'' کہلاتے تھے اور جس کی تقسیم میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ارباب تصوف کی خانقاہیں بھی تعلیم و تعلم کا مرکز تھیں جہاں نامی گرامی علماء اور صوفیاء تعلیم دیتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ کی بنیاد پڑی جس کے بانی ملا نظام الدین تھے جن کے انتساب سے درس نظامی مشہور ہوا اور اس مدرسہ سے ہزاروں طلبہ فیض یاب ہوئے۔

۱۸۵۷ء میں سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا اور پورا ملک بتدریج انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ ۱۷۸۱ء میں وارن ہسٹینگر نے کلکتہ میں ایک مدرسہ ''مدرسہ عالیہ'' کے نام سے قائم کیا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ مسلمان نوجوانوں کو فارسی و عربی کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ حکومت کے مناصب میں حصہ لے سکیں۔ ۱۷۹۱ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کا افتتاح کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس میں ملازمین کمپنی کو فارسی، عربی، ہندوستانی اور بعض دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۲۲ء میں آگرہ کالج اور ۱۸۲۷ء میں دہلی کالج قائم ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں علوم شرقیہ کی تدریس کے لئے لاہور میں اورینٹل کالج قائم ہوا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال تک ہندو مسلمان اکٹھے عام مکاتب میں تعلیم پاتے تھے۔ ابتدائی تعلیم میں خوش خطی، نوشت و خواند، معمولی حساب اور فارسی زبان کی اخلاقی کتابیں ہوتی تھیں جیسے پند نامۂ عطار، کریما، ماقیماں، اخلاق محسنی وغیرہ۔ ثانوی تعلیم کے لئے گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، سہ نثر ظہوری، اخلاق ناصری، سکندر نامہ وغیرہ کتابیں تھیں۔ یہ صورتِ حال انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک رہی تا آنکہ آریہ سماج کی تحریک نے ہندوؤں کو ہندی اور انگریزی زبانوں کی تحصیل کی طرف مائل کر دیا۔ بیشتر مدارس میں رائج نصابِ تعلیم جو درس نظامی کہلاتا ہے ملا نظام الدین فرنگی محلی کا اختیار کردہ ہے۔ اس نصاب میں نحو، منطق و فلسفہ اور فقہ و

اصول فقہ پر خاص زور دیا گیا ہے۔ بیشتر مدارس میں جو شاہ ولی اللہ دہلوی سے منتسب ہیں دورۂ حدیث کا انتظام ہے۔ بعض مدارس میں طب کی کتابیں داخل نصاب ہیں۔ تحریک ندوۃ العلماء نے نصاب تعلیم کی جدت کاری کی اور منطق وفلسفہ کی بعض غیر ضروری کتابیں نصاب سے خارج کیں۔ عربی ادب و بلاغت اور اس فن کے شاہکاروں سے متعارف کرایا۔ علم اعجاز القرآن کا ذوق پیدا کیا اور عربی زبان کو زندہ زبان کے طور پر پیش کیا۔ مولانا حمید الدین فراہی اور مدرسۃ الاصلاح نے تدبر قرآن کی راہ ہموار کی اور نظم قرآن کی بنیاد پر تعلیم قرآن کا نظریہ پیش کیا۔ جامعۃ الفلاح کی تعلیمی تحریک نے مدارس عربیہ کے نصاب میں معاشیات، سیاسیات، علم تمدن، فن تعلیم و تدریس اور جغرافیہ و تاریخ کی بعض سماجی و عمرانی علوم کی شمولیت کا کامیاب تجربہ کیا۔ اب ہائی اسکول کا مروجہ عصری نصاب قبل عالمیت نافذ ہونے کا مسئلہ زیر بحث ہے۔

عالم اسلام میں مغربی استعمار کے اثر ورسوخ اور قبضہ و تسلط سے مدارس کا نظام تعلیم و تربیت بری طرح متاثر ہوا۔ مسلم ممالک میں مغرب کے تعلیمی نظام کے اثر ونفوذ سے قلب ماہیت اور ارتقائے منعکوس کے مناظر سامنے آئے۔ مغربی تعلیم کے علمبردار کالجوں، یونیورسٹیوں اور تحقیقی معاہد کے قیام اور تحریکات کی تشکیل و ترویج نے مختلف مسلم ممالک میں مدارس کے نظام کو مختلف جہتوں سے متاثر کیا۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۰ء میں تنسیخ خلافت کا اعلان کیا اور ملحدانہ اقدامات کے تحت ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء کے درمیان تمام مدارس و مکاتب پر قفل لگوا دیئے۔

جامعہ ازہر کا نظام:

قاہرہ میں جامعہ ازہر کو مختلف اساسی تغیرات کے مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ قاہرہ یونیورسٹی اور دار العلوم جدید علوم کے مرکز قرار پائے اور حکومت اور اشرافیہ کی نگاہوں میں قابل توجہ ٹھہرے اور اس کا خمیازہ الازہر کو بھگتنا پڑا۔ ۱۹۶۱ء میں پارلیمینٹ نے ایک قانون منظور کر کے اس کا بنیادی ہیکل ایک سیکولر ادارہ میں تبدیل کر دیا اور سیکولر مضامین نصاب میں شامل کئے گئے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ میں سائنسی مزاج پیدا ہو۔ عربی زبان و ادب، بزنس ایڈمنسٹریشن، انجینیر نگ، شعبۂ زراعت، انڈسٹریز اور میڈیسین وغیرہ کی فیکلٹیاں بھی قائم کی گئیں اور مدرسہ کا پورا قدیم نظام اس تجدید کاری کی نذر ہو گیا۔

ایرانی نظام مدرسہ:

ایران میں مغربی تعلیمی نظام نے مدرسہ کے نظام کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ رضا شاہ کی مغرب نواز پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی رہنماؤں کی اولادیں بھی جدید اسکولوں اور کالجوں کا رخ کرنے لگیں۔ کلاسیکی علماء اور جدید مسلم دانش وروں کے مابین تعلیمی نظام پر بحثیں شروع ہو گئیں اور قدیم نظام تعلیم کی نتیجہ خیزی اور مؤثر افادیت پر سوالیہ نشان لگ گئے۔ ڈاکٹر علی شریعتی (۱۹۳۳ء۔ ۱۹۷۷ء) نے جو اسلامی انقلاب کے نظریہ ساز سمجھے جاتے ہیں، ۱۹۶۰ء میں اصلاح پسندوں کے ذریعہ قائم کردہ حسینیہ ارشاد اسلامک انسٹی ٹیوٹ کو زیادہ مؤثر اور مفید قرار دیا۔

ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خاتمہ اور آیت اللہ خمینی (۱۹۰۲ء۔ ۱۹۸۹ء) کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی آمد نے مدرسہ نظام تعلیم کا احیاء کیا۔ مذہبی رہنماؤں کی قیادت اور زندگی کے مختلف میدانوں میں ان کی جاندار رہنمائی نے پورے عالم اسلام پر خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ ایران میں قیادت و سیادت کے مناصب پر آیت اللہ براجمان ہوئے اور حکومت اشرافیہ اور سرکاری عملہ کی توجہ بھی مدارس کو حاصل ہوئی۔ پاکستان میں صدر جنرل ضیاء الحق (م ۱۹۸۸ء) کے دور میں دینی مدارس کی تجدید بھی ہوئی اور ان کی اسناد کو ملازمتوں کے لئے تسلیم بھی کیا گیا۔ ہندوپاک سے برطانیہ و امریکہ کو شمالی افریقہ سے فرانس کو، ترکی سے جرمنی کو حالیہ برسوں میں ہجرت کرنے والے مسلمانوں نے یوروپ میں مذہبی مدارس قائم کیے اور مسلمان تارکین وطن کی نئی نسل قرآنی مدارس سے استفادہ کر رہی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کا نظام مدارس:

ترکی میں ۱۹۵۱ء میں امام ہاتپ اسکول قائم کیے گئے تھے جن کی تعداد ۱۹۸۶ء میں ۳۸۶ ہو گئی تھی۔ یہ اسکول دراصل مدارس کے نظام کی توسیعی شکل تھے۔ اب جدید ترکی میں ان اسکولوں کا جال بچھ گیا ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں اب قدیم و جدید نصاب کے حسین امتزاج کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے کالجز، جامعات اور علمی و تحقیقی ادارے اسی مدرسہ نظام کی توسیع ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں خرطوم سوڈان میں افریقن اسلامک سینٹر قائم ہوا۔ دمشق یونیورسٹی میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کلیۃ الشریعہ کا قیام عمل میں آیا۔ اسلام آباد پاکستان اور کوالالمپور ملیشیا میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۹۸۷ء ہی میں کوالالمپور میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف

اسلامک سویلیزیشن کی تاسیس ہوئی۔انڈونیشیا میں IAIN (Institute Agama Islam Negeri) کی بنیاد رکھی گئی۔یہ سب مدرسہ نظام تعلیم ہی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا میں مدرسہ نظام تعلیم بڑا موثر اور انقلابی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ملیشیا بطور خاص کیدہ اور کیلانٹین کے علاقوں میں اور جنوبی تھائی لینڈ میں مدرسہ نظام تعلیم پونڈک پیسانٹرین (Pondak Pesantren) کے مقامی نام سے جانا جاتا ہے۔لفظ پونڈک عربی لفظ ''فندق'' سے نکلا ہے جو قرآن اور دوسرے مذہبی مضامین کی تدریس کے لئے قائم ہونے والے بورڈنگ اسکولوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔اور پیسانٹیرن کا لفظ Santri سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے ''مذہبی طلبہ''۔اس طرح کے مدرسوں میں ایک استاد kijaji یا kiyayi کے نام سے ہوتا ہے اور تین چار سے لے کر ہزار تک طالب علم ہوتے ہیں جو سانتری Santri کہلاتے ہیں۔یہ سانتری طلبہ پونڈک اقامت گاہوں میں مل جل کر رہتے ہیں جو اپنا کھانا خود پکاتے ہیں اور کپڑے خود دھوتے ہیں۔طالبات کے لئے یہی نظم علیحدہ اور مستقل رہتا ہے۔طلبہ ایک پیسانٹرین سے دوسرے پیسانٹرین کا رخ کر کے مختلف مذہبی مضامین میں ''اجازہ'' (سرٹیفکیٹ) حاصل کرتے ہیں مگر اصل مدرسہ سے براہ راست مربوط رہنے کے لئے سال میں ایک بار وہاں کا رخ ضرور کرتے ہیں۔یہ مدارس قناعت وکفاف اور نظم وانضباط کے ساتھ مذہبی اصولوں کی بھرپور پاسداری کی تربیت دیتے ہیں۔انڈونیشیا میں اس طرح کے بورڈنگ مدارس کا زیادہ تر انحصار خود کیائی یعنی معلّم کی ذات پر ہوتا ہے۔عام طور پر معلم کی وفات سے طلبہ کا نقصان ہوجاتا ہے اوران کی تعلیم کا تسلسل ختم ہوجاتا ہے۔انڈونیشیا میں اس طرح کے مدارس کی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہے۔جو آٹھ ملین طلبہ وطالبات کو دینی علوم کا درس دے رہے ہیں۔

سادگی، کفایت شعاری، صبر وقناعت اور ٹھیٹھ مذہبی زندگی گذارنے کی تربیت دینے والے ان پیسانٹرین مدارس پر بھی زمانہ کے سرد وگرم کا اثر پڑتا ہے۔بعض مدارس میں اب کلاس روم اور کرسی ومیز کی جدّتیں بھی داخل ہوگئی ہیں۔مثال کے طور پر مشرقی جاوا کے علاقہ Gontor Ponoroga میں مشہور مدرسہ Pendidikan Darussalam کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طلبہ کے متعدد وفود اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مشرق وسطی کے ملکوں میں بھیجے۔اس مدرسہ میں مشرق وسطی سے لوٹ کر آنے والے انڈونیشیائی اساتذہ بھی تعینات ہیں۔دار السلام کی سندوں کو ازہر یونیورسٹی نے بھی تسلیم کر رکھا ہے۔

انڈونیشیا میں دینی تعلیم کا ایک دوسرا نظام بھی کارفرما ہے جو "مدرسہ دینیہ" کہلاتا ہے۔ یہ پیسانٹرین نظام سے قدرے مختلف ہے اس نظام کے تحت سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ و طالبات کو دینی تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ ثانوی سطح کی سرکاری تعلیم مکمل کرنے کے بعد گویا دور ثالث میں انھیں مذہبی علوم میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ مدرسے تین مرحلوں میں چلتے ہیں۔ مدرسہ ابتدائیہ، ثانویہ اور مدرسہ عالیہ۔ مدرسہ ابتدائیہ نیگیری (M.I.N.) سرکاری سطح پر چھ سالہ نصاب پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۰ء سے مدارس میں سیکولر مضامین بھی حکومت نے داخل کردیئے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ابتدائیہ کے نصاب میں تیس فیصد مضامین مذہبی تھے جبکہ عالیہ کے نصاب میں ستر فیصد مضامین مذہبی تھے۔ انڈونیشیا میں حالیہ برسوں میں مذہبی سیاسی جماعت نہضۃ العلماء کے زیر اثر دینی تعلیم کے ان دونوں نظاموں (مدرسہ نظامیہ اور پیسانٹرین) میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اب ان دونوں نظاموں کے طلبہ قومی تعلیم کی اعلیٰ درس گاہوں، جامعات اور تحقیقی معاہد میں داخل ہو کر تعلیمی نظام کی دوئی کو مٹا رہے ہیں۔

سنگاپور میں تقریباً چھتیس دینی مدارس ہیں جن میں چار مدرسوں میں ابتدائی و ثانوی دونوں معیار اور سطح کی تعلیم کا نظم ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ان مدارس نے حساب، سائنس، انگریزی کے مضامین بھی شامل نصاب کئے۔ اب یہ طلبہ سرکاری امتحانات میں بیٹھنے کے اہل بھی ہو گئے ہیں۔ یہاں کے طلبہ مشرق وسطی سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ انھیں ازہر اور مشرق وسطی کے اداروں میں داخلہ پانے کا موقع ملا۔ البتہ جامعہ الازہر نے صرف مدرسۃ الجنید الاسلامیۃ کی سند تسلیم کی ہے اور دوسرے مدارس کے طلبہ کو مشرق وسطی کے اداروں میں داخلہ لینے کے لئے یہاں ایک سال گذارنا پڑتا ہے۔ مالی مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کے لئے مسلم تنظیم MUIS (Majlis Ugama Islam Singapur) نے یہاں کے مدارس کو اپنی سرپرستی اور کفالت میں لے لیا ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں تھائی لینڈ کے پونڈک مدارس میں حکومت نے مداخلت کی۔ انھیں باضابطہ پرائیوٹ اسکولوں میں تبدیل کر کے خالص مذہبی تعلیم میں محدود کردیا۔ ان پونڈک مدارس کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ دوران تعلیم طلبہ دور دراز کے دیہاتوں میں تبلیغ و دعوت کا کام کرتے ہیں۔ اور معاشرہ کی اصلاح سے براہ راست ربط رکھتے ہیں۔ اس وقت یہ مدارس حکومت کے کنٹرول میں ہیں اور یہاں کے طلبہ کو مشرق وسطی کے ملکوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے داخل ہونے کا موقع فراہم ہونے لگا۔ ان کے ذریعہ عالم اسلام کے افکار و رجحانات اور تجربات بھی یہاں اثر و نفوذ کرنے لگے ہیں۔ (موناابا ظہ کا مقالہ "مدرسہ" دی آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی موڈرن اسلامک ورلڈ، مرتب جان ایل اسپوزیٹو، ۱۹۹۵ء ج ۳ ص ۱۵-۱۶)

دارالعلوم دیو بند

شاندار تاریخ:

دارالعلوم دیو بند کی بنیاد ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء کو وہیں کی ایک قدیم مسجد چھتہ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء۔ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے چند اصحاب فضل و تقوی اکابر کے تعاون سے رکھی جن میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، مولانا ذوالفقار علی دیو بندی اور حاجی عابد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس درس گاہ کے پہلے مدرس مولوی محمود دیو بندی، سب سے پہلے طالبعلم مولانا محمود حسن اور سب سے پہلے صدر مدرس (۱۸۸۸ء۔ ۱۸۶۷ء) مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سب سے پہلے سرپرست مقرر ہوئے۔ آگے چل کر یہ معمولی مدرسہ ایک عظیم درس گاہ بن گیا اور مسجد چھتہ سے نئی عمارت میں منتقل ہو گیا جس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے اپنے ہاتھ سے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں رکھا۔ ۱۹۷۶ء میں ادارہ کی صدی تقریبات میں وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی کی شرکت نے ادارہ کو دو دھڑوں میں منقسم کر دیا۔ کانگریسی سیاست سے بیزار اور وحدت ملی سے سرشار مولانا قاری محمد طیب قاسمی نے اس ادارہ سے علیحدگی اختیار کر کے جامع مسجد میں نئے ادارہ دارالعلوم وقف کی بنیاد رکھی جو بعد میں نئی پُرشکوہ عمارتوں میں منتقل ہو گیا۔ قدیم دارالعلوم کا انتظام و انصرام مولانا سید اسعد مدنی امیر جمعیت علماء ہند کے ہاتھ میں رہا۔ عارضی طور پر دونوں اداروں میں کچھ کشاکش رہی لیکن اب دونوں ادارے تعلیم و تدریس اور تبلیغ و اصلاح میں یکسوئی کے ساتھ مصروف ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی دینی و تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا جس کے پیش نظر اہم مقاصد یہ تھے:

(۱) آزادیٔ ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق

(۲) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جدوجہد

(۳) شاہ ولی اللہ دہلوی کے مسلک کی حفاظت و اشاعت

(۴) مسلم معاشرہ سے خود غرضی واستبداد کا خاتمہ

(۵) علوم دینیہ کا احیاء

(۶) علوم عقلیہ کی صحیح تربیت

(۷) دین میں مہارت کے ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علماء پیدا کرنا (۲)

دارالعلوم کی مالی ضروریات کی تکمیل کے سلسلہ میں بانی نے آٹھ اصول مقرر کر دیئے جن کا مقصد اسے حکومت وقت کی مداخلت سے بچانا اور امراء واصحاب ثروت کے تسلط سے محفوظ رکھنا تھا ''یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور برہمنی حکومت کی خواہش کے باوجود دارالعلوم نے کسی سے آج تک گرانٹ لینا پسند نہیں کی'' (۳)

اپنے نصاب تعلیم میں دارالعلوم نے دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد کے تینوں دبستان علم وفکر کی روح سمونے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی کا دہلی تفسیر وحدیث کے مضامین کے لئے، لکھنؤ فقہ کی تعلیم کے لئے اور خیر آباد کلام وفلسفہ کے لئے مخصوص تھا۔ دیوبند نے ان تینوں کے امتزاج کی نمائندگی کی۔ چنانچہ اس درس گاہ میں علم صرف ونحو، ادب، علم معانی، منطق، فلسفہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، علم فرائض، علم عقائد، علم کلام، علم مناظرہ، علم ہیئت اور قرأت وتجوید کے علاوہ فارسی زبان وادب کی تعلیم بھی داخل کی گئی۔ البتہ دورۂ حدیث کے نصاب نے اس ادارہ کی شان و شوکت میں اضافہ کیا اور دور دراز کے طلبہ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد کھینچ کھینچ کر یہاں آنے لگے۔ ۱۹۶۷ء تک ہندوستان کے طول وعرض سے تین ہزار سات سو پنچانوے، اس وقت کے مشرق ومغرب کے پاکستان سے تین ہزار ایک سو اکیانوے اور بیرونی ممالک سے چار سو اکتیس علماء فارغ التحصیل ہو چکے تھے (۴)۔ مختلف خطوں اور ملکوں کے رہنے والے طلبہ یہاں اقامت گاہوں میں ایک ساتھ رہائش رکھتے اور سب اردو زبان بولنے پر قادر ہو جاتے تھے۔ ابتدائی دور میں ملک کے تمام صوبوں کے علاوہ وسط ایشیا اور افغانستان کے طلبہ زیر تعلیم ہوئے پھر بیسویں صدی میں مشرقی وجنوبی افریقہ، یوروپ اور شمالی امریکہ کے طلبہ بھی داخل ہوئے۔

معتدل مسلک:

علمائے دیوبند عام طور سے حنفی المسلک، منہج شاہ ولی اللہ سے منتسب اور تصوف و روحانیت کے حلقہ میں شامل رہے۔ وہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۹ء) کو اپنا پیرو مرشد تسلیم کرتے رہے۔ جو سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے پیرو تھے۔ عقائدی مسائل میں امام ابوالحسن اشعری (۸۷۳ء۔۹۳۵ء) کے ہم نوا اور بدعات وخرافات کے مخالف ہیں۔ تصوف سے عقیدت رکھنے کے باوجود "درگاہی تصوف" کے ناقد ہیں۔ انھوں نے عام طور پر دین کی تعبیر وتشریح روایتی انداز میں کی ہے اور غلو وانتہا پسندی سے اجتناب کر کے اعتدال وتوازن کی راہ اختیار کی ہے۔ وہ تکفیر و تفسیق کے مخالف رہے اور عام طور پر مسلمانوں کے خلاف فتویٰ بازی سے پرہیز کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک بار اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کہا "فی زمانا کفار کا غلبہ ہے۔ وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو، بلکہ توڑنے کے بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔" (۵) علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک موقع پر صراحت کی: "ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں، نہ تمام شیعوں کو نہ سارے نیچریوں کو۔" (۶) بعد میں اس فہرست میں ایسے علماء بھی شامل ہو گئے جو اعتدال کے اس موقف کو چھوڑ کر حالات کے دباؤ میں تکفیری لٹریچر کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے باز نہ رہے۔ اور مختلف سیاسی و سماجی مفادات کے حصول کے لئے ملت میں افتراق و انتشار کی تخم ریزی کی۔ ۷،۸/صفر ۱۴۲۲ھ/۲۔۳مئی ۲۰۰۱ء میں تال کٹورہ اسٹیڈیم میں منعقد دہلی کی "تحفظ سنت کانفرنس" اسی نامسعود سلسلہ کی ایک کڑی اور بانیانِ ادارہ کے متوازن موقف سے انحراف کا نقطۂ عروج تھی۔

درس نظامی کے معروف نصاب ونظام تعلیم اور تصوف وسلوک سے عقیدت وانتساب کے توشہ کے ساتھ علمائے دیوبند نے ملک کے مختلف علاقوں میں درس گاہیں قائم کیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد اور پھر پاکستان میں مدرسہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور، مدرسۂ عربی خیر المدارس ملتان، دار العلوم ٹنڈو اللہ یار خاں، دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور اور راجشاہی کے دیوبندی مدارس سب اسی علمی روایت کے امین اور پاسبان ہیں۔ قیام دار العلوم دیوبند کے بعد ایک صدی کی مدت میں ان خدا ترس بزرگوں نے تقریباً آٹھ ہزار نو سو

چونتیس مکاتب و مدارس اسی طرز و نہج پر قائم کرڈالے اور دیوبندی علماء کی فوج ظفر موج تیار کردی۔ ان علماء کی اکثریت دنیا کے مختلف خطوں میں مساجد کے امام و متولی، مکاتب کے استاذ و منتظم، مقابر کے محافظ و سرپرست، داعی مبلغ و خطیب اور مصنف و محقق کی حیثیت میں دین متین کی روشنی پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

جنگ آزادی کی جدوجہد:

علمائے دیوبند نے جنگ آزادی کی جدوجہد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحریک اور درس گاہ نے اگر عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی تو انفرادی طور پر مختلف علمائے کرام نے سیاست میں سرگرم حصہ بھی لیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء۔۱۹۴۴ء) جو حکمت ولی اللّٰھی کے شارح و ترجمان کی حیثیت سے معروف ہوئے اور جنھوں نے پہلے علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان پُل کا کام کیا، پہلی عالمی جنگ کے درمیان افغانستان تشریف لے گئے اور وہاں جرمن اور ترک انقلابیوں کے ساتھ مل کر انگریز حکومت کے خلاف محاذ آرائی کی۔ مولانا محمود حسین دیوبندی (۱۸۵۱ء۔۱۹۲۰ء) نے جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے سرفراز ہوئے، تحریک ریشمی رومال کی قیادت کی حجاز میں عثمانیوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کیا اور مالٹا جلاوطن کیے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند قائم ہوئی تو علمائے دیوبند کی ایک بڑی تعداد اس میں شامل ہو کر قومی تحریک آزادی میں انڈین نیشنل کانگریس کا دست و بازو بنی۔ ان کے پیش نظر ایک ایسا ہندوستان تشکیل دینا تھا جس میں مختلف مذہبی اکائیوں کا ایک وفاق وجود میں آئے۔ آزادی کی تحریک عروج کو پہونچی تو مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۷ء) نے تحریک پاکستان اور قومی نظریہ کی بھرپور مخالفت کی۔ ان کے ساتھ دیوبندی علماء کی اکثریت نے کانگریس کی ہم نوائی کی اور علامہ محمد اقبال (۱۸۷۳ء۔۱۹۳۸ء) کے نظریۂ ملت واحدہ اور تصور قومیت اور وطنیت کو تسلیم نہ کیا۔ دوسری طرف علمائے دیوبند کے ایک اقلیتی گروہ نے ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں جمعیت علمائے اسلام قائم کی اور مسلم لیگ کی حمایت کی اور تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا جیسے علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۸۶۳ء۔۱۹۴۳ء) مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۸۷۔۱۹۴۹ء)، مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبد الحمید بدایونی (م ۱۹۶۹ء) وغیرہ (۸)۔ انہی علماء کی تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ داری کا نتیجہ تھا کہ تقسیم سے قبل صوبہ سرحد میں ہونے والے استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کو کامیابی ملی۔

فتویٰ نویسی:

دینی و علمی خدمات کے میدان میں دار العلوم دیو بند اور اس سے متاثر و منتسب اداروں اور علماء کی فتوی نویسی کافی ممتاز ہے۔ ایک مفتی کی حیثیت میں مسلمانوں کے مذہبی مسائل و معاملات میں شریعت کی روشنی میں رہنمائی علمائے دیو بند کا امتیازی کارنامہ ہے۔ انھوں نے عام طور سے فقہ حنفی کی ترجمانی کی ہے اور عام مسلمانوں کے لئے تقلید شخصی کو لازم قرار دیا ہے۔ ابتدائی دور کے فتاوی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عام طور سے فقہی امہات کتب کے حوالے نہیں دیئے جاتے تھے کیونکہ ایک عالم اور شیخ کے ارشادات پر عمل کرنا عام لوگوں کے لئے ضروری ہے اور انھیں چوں چرا کرنے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ فتنوں کے دور میں بسا اوقات مباحات مطلوب کے درجہ میں آجاتی ہیں۔(۹) ۔تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں مباح کو مطلوب قرار دے کر رفع نزاع اور اتحاد ملت کی خاطر قرآن کریم کو قریش کے اسلوب کے مطابق جمع و مدوّن کیا گیا تو آج بھی تقلید شخصی کو مطلوب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے عالم دین اور مفتی کو بہت محتاط رہنا ضروری ہے تاکہ اس کی لغزشوں سے دوسرے مسلمانوں کو نقصان نہ پہونچے۔(۱۰)۔ حاجی رشید احمد گنگوہی نے اپنے معتقدین کو تاکید کی کہ شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ کی تحریروں کے حوالے دیں۔ کیونکہ وہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے عالم و مرشد ہیں۔ قرآن اور حدیث کا حوالہ مناسب نہیں ہے کیونکہ عام مسلمانوں اور اشراف کا اس سلسلے میں مطالعہ خام اور ناقص ہے۔ خود فتاوی میں عام طور پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ سائل کسی عالم سے یا اہل حق سے رجوع کرے (۱۱)۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سر سید احمد خاں سے مراسلت میں تقلید شخصی پر کافی زور دیا اور استدلال کیا کہ کسی عالم دین سے اس کے فتوی کی قرآن و حدیث سے سند طلب کی جاسکتی ہے اور قرآن و حدیث کے اتباع کے مقابلہ میں عالم کی تقلید ثانوی ہے مگر یہ بھی مطلوب ہے اور تقلید کو شرک قرار دینا غلط ہے۔

علمائے دیو بند کی فتوی نویسی رفتہ رفتہ مسلم حلقوں میں معتبر و مستند ہوتی گئی۔ ابتدا میں مولانا محمد یعقوب قاسمیؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اس خدمت پر مامور تھے۔ ۱۸۹۳ء میں جب پورے ہندوستان سے استفتا آنے لگے تو ایک علیحدہ دار الافتاء کا قیام عمل میں آیا اور مفتی عزیز الرحمٰن نقش بندی مجددی اس کے انچارج مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء سے ان تمام فتووں کے اندراج

کے لئے ایک رجسٹر رکھا گیا تا کہ اس کی جلدیں مرتب ہو کر شائع ہوتی رہیں۔ پہلی صدی تقریب تک ۲ لاکھ انہتر ہزار دو سو پندرہ فتاوی ریکارڈ کئے گئے اور ملت اسلامیہ ہند کے مختلف و متنوع مسائل کو فقہ حنفی کے ماخذ کی روشنی میں حل کیا گیا۔ (۱۲)

فتاویٰ کی جو جلدیں شائع ہو گئی ہیں اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا موضوع اکثر عبادات، فرائض و نوافل، عقائد، رسوم و روایات اور ردّ بدعات ہیں۔ نکاح و طلاق اور میراث کے مسائل پر بھی فتوے دیئے گئے ہیں مگر سیاست و سماج، انتظامیہ، عدالتی امور اور برطانوی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل عام طور سے زیر بحث نہیں آئے۔ البتہ بدعت کی تعریف، اقسام وانواع اور ان کے بارے میں شریعت کے موقف پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاویٰ میں البتہ تقریباً ایک تہائی حصہ تصوف اور اس کے مسائل پر محیط ہے۔ تصوف کی اہمیت، شیخ کا تصور اور اس کا کردار، ذکر جلی کی اباحت، زیارت قبور، عروس وقوالی کا اہتمام، فاتحہ خوانی وغیرہ موضوعات اور ان سب میں شریعت کی بالادستی کی تاکید پر کافی بحثیں ملتی ہیں۔

فتاویٰ دیوبند میں غیر اسلامی رسوم و روایات اور تقریبات کی بھرپور تردید ہے۔ میلاد النبی کی تقریبات کی مخالفت کی گئی ہے کہ اس سے ایک مرحوم شخص کے زندہ جاوید اور حاضر و ناظر ہونے کے عقیدے کو تقویت ملتی ہے اور ایک مخصوص دن کا تقدس لازم آتا ہے اور ہندوؤں کے تہواروں سے بڑی حد تک مشابہت ہو جاتی ہے۔ حاجی رشید احمد گنگوہی کے دور میں میلاد النبی تقریب کی ممانعت میں علمائے دیوبند کے دستخط سے باقاعدہ فتویٰ جاری ہوا۔ (۱۳)۔ علماء نے خود نبی کریم ﷺ کی خواب میں زیارت اور میلاد کی ممانعت کی حکایات شائع کیں (۱۴)۔

دیوبند کے فتاویٰ میں انگریزوں کے قوانین اور ان کی انتظامیہ کے خلاف بیانات موجود ہیں۔ فتاویٰ رشیدیہ نے بالکل صراحت کر دی کہ یہ امر باعث تعجب نہیں کہ حکومت برطانیہ نے جو قوانین بنائے ہیں وہ خلاف شرع ہیں (۱۵)۔ اسی لئے انھوں نے ایک مستفتی کو انگریزی قانون کے خلاف برتری کے اظہار کے لئے حیلہ کے استعمال کی بھی اجازت دی اور یہ حکومت اگر کسی شخص کو ظالمانہ طریقے سے گرفتار کرے تو جیل سے بھاگ جانا اس کے لئے جائز ہے (۱۶)۔

انھوں نے برطانوی مالی وصنعتی اداروں کوشرع میں مداخلت کرنے کا مجرم ٹھہرایا اوران کی تیار کردہ اشیاء کے استعمال کو ناجائز قرار دیا۔ سہارنپور کے ایک مشنری اسکول سے اپنی لڑکیوں کو نکال لینے کا فتویٰ جاری کیا (۱۷)۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ انگریز دواؤں، بسکٹوں اور خضاب وغیرہ کی تیاری میں الکحل کی آمیزش کرتے ہیں اس لئے ان کو استعمال کرنا شرعاً غلط ہے۔ مسجدوں میں ان کی تیار کردہ ماچس نہ استعمال کی جائے کہ اس سے بُو آتی ہے۔ انگریزوں کا لباس نہ پہنا جائے۔ یہ فتویٰ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے بھی دیا تھا (۱۸)۔ البتہ انگریزی سیکھنے اور عیسائی اداروں میں ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ہندوؤں سے کوئی نزاع ہو جائے تو باہم جھگڑنے اور قتل وخون کرنے کے بجائے انگریزی حکومت سے رجوع کرنا بہتر ہے (۱۹)۔ کیمرہ، ٹیلی گراف، گراموفون، ٹوتھ برش اور دوسری اشیائے مصنوعات جو انگریزوں کی تیار کردہ تھیں، علمائے دیوبند کے نزدیک مباح تھیں بشرطیکہ ان کی تیاری میں حرام وممنوع چیزوں کا استعمال نہ کیا گیا ہو (۲۰)۔

طریقت سے وابستگی:

علمائے دیوبند کا ایک امتیاز تصوف وطریقت سے ان کی گہری وابستگی ہے۔ درگاہی تصوف پر تنقید کرنے کے ساتھ انھوں نے روحانیت اور تصوف کی ایک دوسری دنیا بسائی جہاں ان مشرکانہ تصورات واعمال کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ دارالعلوم کے سرپرستوں میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حاجی رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند محمود حسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ سب ممتاز صوفی تھے۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ (م ۱۳۴۶ھ)، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ (م ۱۳۸۲ھ)، مولانا وصی اللہ الہ آبادیؒ (م ۱۳۸۷ھ)، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ (م ۱۳۹۷ھ) مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (م ۱۴۰۲ھ)، مولانا اطہر علی بنگالیؒ (م ۱۳۹۶ھ)، مولانا رسول خان ہزارویؒ (م ۱۳۹۱ھ) وغیرہ دیوبندی علماء تصوف وسلوک سے وابستہ اور روحانی پیشوا تھے۔ ان شیوخ نے کسی ایک سلسلۂ تصوف سے وابستگی کے بجائے سارے سلاسل کی نمائندگی کی۔ شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ھ) چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور فردوسیہ کے عامل تھے حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے مریدوں اور معتقدین کو چشتیہ صابریہ، چشتیہ نظامیہ، نقش بندیہ، نقش بندی مجددیہ، سہروردیہ اور قدسیہ سارے صوفی سلسلوں سے بیعت ہونے کی تلقین کی (۲۱)۔ دراصل علمائے دیوبند سلوک ومعرفت میں چشتی مگر تمام سلاسل کے جامع تھے (۲۲)۔ تاہم یہ امر بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ علمائے دیوبند عام طور سے حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل رہے ہیں۔

ملا قاسم نے مثال کے طور پر مولانا محمد یعقوبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی جو دراصل امدادیہ سلسلہ سے بیعت تھے اور بنیادی طور پر ان کا تعلق چشتیہ صابریہ اور قادریہ سلسلوں سے تھا (۲۳)۔

دعوتی مناظرے:

علمائے دیوبند کا ایک بڑا کارنامہ عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں کے خلاف مناظروں کا انعقاد اور ان میں اسلام کی صداقت وحقانیت کا اثبات ہے۔ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی سیاسی محکومی کے بعد اسلام کی ابدیت وحقانیت کو اور پیغمبر اسلام کی سیرت وتعلیمات کو ان مناظروں میں سر عام چیلنج کیا گیا جس کا مسکت جواب علمائے اسلام نے دیا۔ ان مناظروں میں شریک ہونے والے ایک نامور عالم دین مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی خدمات بڑی وقیع ہیں۔ مولانا کیرانوی اور جرمن مشنری عالم پادری کے.جی فانڈر (K.G.Pfander) کے درمیان ایک معرکہ آرا مناظرہ آگرہ میں ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ مولانا کیرانوی نے عیسائیت کے خلاف دلائل کے انبار لگا دیئے۔ انھوں نے عقیدۂ تثلیث پر بھرپور تنقید کی۔ عیسائیوں کی مذہبی کتب میں ہونے والی تحریفات کی نشاندہی کی۔ عیسائیوں کے دعاوی اور معجزات پر ان کے بیانات ودلائل پر مدلل جرح کی اور آخر میں یہ خلاصہ پیش کیا کہ سابقہ الہامی کتابوں کی جو تصدیق قرآن کریم کرتا ہے اس کا غلط مطلب عیسائیوں نے نکالا ہے (۲۴)۔ قرآن پاک مصدّق بھی ہے اور مہیمن بھی۔ وہ کتب سابقہ کی تصدیق بھی کرتا ہے اور ان میں راہ پا جانے والے انحرافات پر تنقید بھی کرتا ہے۔ مولانا کیرانوی کے یہ دلائل بعد میں ہونے والے مناظروں میں متعدد بار دہرائے گئے۔

ان مناظروں میں جن عیسائی پادریوں نے عام طور پر شرکت کی ان کا لب ولہجہ عامیانہ، سوقیانہ بلکہ اشتعال انگیز ہوا کرتا تھا۔ امریکی پادری E.M. Wherry جس نے عام طور پر اپنی تحریروں میں مسلمانوں ہی کو مخاطب کیا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ عیسائی پادری مسلم عقائد وتعلیمات کی غلط ترجمانی کرتے تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلام پر ناروا حملے کرتے تھے (۲۵)۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے بیان کے مطابق ان عیسائیوں کی بڑی تعداد دیہاتیوں پر مشتمل تھی جو وقتی مفادات ومصالح کی خاطر حکومت وقت کا مذہب قبول کر بیٹھے تھے (۲۶)۔

مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ ومناظرہ کا ایک تاریخ ساز عمل چاند پور ضلع شاہجہاں پور اتر پردیش میں ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء میں انجام پایا جو "میلۂ خداشناسی" کے نام سے

معروف ہے۔ یہ مناظرہ سہ جہتی تھا۔ عیسائی، دیوبندی اور ہندو آریہ سماج اس کے فریق تھے۔ اسے کسی قدر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی کیونکہ اس کے منتظمین میں مشن اسکول کے پرنسپل سموئیل نولس (Samuel Knowles) حکومت کا ایک ہندو افسر پیارے لال کبیر پنتھی (جس نے شرکاء مناظرہ کے طعام کا بندوبست کیا تھا) اور ایک مسلمان آنریری مجسٹریٹ موتی میاں (جو دونوں سالوں کے مناظرہ کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے تھے) شامل تھے۔ مشن اسکول کے وسیع میدان میں یہ مناظرہ منعقد ہوا۔

اس مناظرہ میں ہر مذہب کے دو نمائندوں کو مقررہ وقت میں اپنی تقریر کرنا تھی اور اس کے بعد ہر فریق کو سوالات و مباحثہ اور تردید و اعتراض کے لئے موقع فراہم کیا گیا تھا۔ عیسائیوں نے ایک نوعیسائی پادری تاراچند کا اضافہ کر کے مناظرہ کا استحصال کرنے کی کوشش کی۔ آریہ سماجی نمائندہ نے سنسکرت زبان میں تقریر کر کے عوام کو اُلّو بنانے کی کوشش کی۔ علمائے دیوبند کی طرف سے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا سید ابوالمنصور دہلوی حاضر ہوئے مئی کی سخت گرمی مناظرہ پر اثر انداز ہوئی۔ اگلے سال مارچ میں لوگ دوبارہ جمع ہوئے۔ آریہ سماجی تنظیم کا بانی دیانند سرسوتی اپنے ساتھ منشی اندرامان کو لیکر شریک مناظرہ ہوا جس نے اسلام ترک کر کے ہندومت اختیا کیا تھا اور اپنے پرانے ہم مذہبوں کے خلاف بھڑاس نکالنے میں مشہور تھا۔ مشنری نمائندوں میں نولس کے علاوہ تھامس جیفرسن اسکاٹ (Thaomas Jefferson Scott جو بریلی مشنری سے وابستہ تھا) مقدس نوبل، جان تھامس (ہندوستان پادری جو بریلی کے دینیات اسکول سے منسلک تھا)، ای ڈبلیو پارکر (Parker) جو ضلع روہیل کھنڈ کا صدر اعظم تھا اور مقدس واکر (Walker) شامل تھے۔

مناظرہ کے موضوعات کچھ اس طرح تھے۔ تخلیق کائنات کی فطرت، خدا کی وحدانیت، خدا کی صفاتِ رحمت و عدل میں نظر آنے والا تضاد، ویدوں، بائیبل اور قرآن کے الہامی ہونے کے دلائل، نجات کا مفہوم اور اس کے وسیلے وغیرہ۔ ان تمام اصطلاحات و تصورات پر ہر مذہب کے نمائندے نے اپنے مآخذ و مصادر کی روشنی میں اظہار خیال کیا۔ مولانا نانوتوی کی تقریر سب سے موثر، دلنشیں اور مدلل تسلیم کی گئی۔ عام ہندوں کو مولانا نانوتوی کی طرف اشارہ کر کے بارہا کہتے سنا گیا کہ یہی مولوی ہے جس نے پادریوں کا منہ بند کر دیا ہے۔ یہ کوئی مولوی نہیں اوتار معلوم ہوتا ہے (۲۷)۔

××××××××××××××

تعلیقات وحواشی:

(۱) دیوبند اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کا ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ یہاں درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان گھرا ہوا کسی دیوی کا مندر ہے۔ جس کے پیش نظر خیال کیا جاتا ہے کہ دیوبند کو دیوبن (دیوی کا جنگل) کی بگڑی ہوئی شکل تصور کرنا چاہئے۔ دیوبند کا ذکر سب سے پہلے آئینِ اکبری میں ملتا ہے جس میں ابوالفضل دیوبند میں بنی ہوئی پختہ اینٹوں کے ایک قلعہ کا ذکر کرتا ہے۔ چھتہ مسجد کو دیوبند کی قدیم ترین یادگار تصور کیا جاتا ہے جس کا تعلق پٹھان دور کے ابتدائی زمانہ سے ہے۔ روایت ہے کہ شیخ علاؤالدین معروف بہ شاہ جنگل باش، جو وہاں مدفون ہیں، ابن الجوزی کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ سکندر لودی، اکبر اعظم اور اورنگ زیب کے دور میں تعمیر شدہ بعض مساجد اور عمارتیں ابھی تک موجود ہیں۔ انیسویں صدی کے بعد اس قصبہ کی شہرت دارالعلوم کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں ہوگئی۔ دیکھئے اردو دائرہ المعارف اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۲ء ج ۹ ص ۶۲۰۔۶۲۱

(۲) مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، لاہور ۱۹۶۹ء ج ۲ ص ۳۲۰

(۳) انوار الحسن قاسمی، انوار قاسمی، دیوبند ۱۹۵۸ء ج ۱ ص ۳۷۴۔۳۷۵

(۴) The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World , ed. John L. Esposito, Oxford, 1995, Vol. 1. P. 362

(۵) مناظر احسن گیلانی، حوالہ بالا، ج ۱ ص ۴۸۰

(۶) مولانا شبیر احمد عثمانی، الشہاب ص ۲۰۔۲۱

(۷) تحفظ سنت کانفرنس منعقدہ ۷۔۸ صفر المظفر ۱۴۲۲ھ / ۲۔۳ مئی ۲۰۰۱ء امیر جمعیۃ العلماء ہند مولانا سید اسعد مدنی کی دعوت پر تال کٹورہ اسٹیڈیم نئی دہلی میں واقع ہوئی۔ کانفرنس کی غرض و غایت اس کے داعی محترم نے اپنے دعوت نامہ میں بیان کرتے ہوئے صراحت کی کہ اہل حدیث فرقہ نے ''انگریزوں کی وفاداریوں کے صلہ میں'' دربار حکومت سے اپنے لئے اہل حدیث نام الاٹ کرالیا اور عوام الناس کو یہ باور کرانے لگا کہ ''کتاب وسنت پر بس یہی فرقہ عامل ہے اور بقیہ سارے فقہاء کے اجتہادات واقوال وآراء کے پابند ہیں'' اس فرقہ کا عمل بالحدیث صرف دعوی کی حد تک ہے۔ ان کا اصل منشا جماعت مسلمین میں انتشار پھیلانا

ہے۔اس فرقہ کے نزدیک جو رفع یدین کرے، قرأت خلف الامام کا قائل ہو اور آمین بالجہر پر عمل پیرا ہو" وہ سچا پکا محمدی عامل بالحدیث اور فرقہ ناجیہ کا مصداق ہے خواہ وہ مطلق جاہل، فرائض دینیہ سے غافل، اور بدکردار کیوں نہ ہو اس کے بالمقابل جو شخص احادیث نبویہ ہی کے پیش نظر ان مذکورہ باتوں کو اختیار نہ کرے وہ عالم باعمل ہونے کے باوجود نہ محمدی ہے نہ عامل بالحدیث۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ فرقہ ناجیہ واہل سنت والجماعت سے بھی خارج ہے" نیز یہ کہ اس فرقہ نے محافظین دین اور پاسبانِ اسلام علماء دیوبند کو اسلام سے خارج کر دینے کی ناپاک مہم چلا رکھی ہے۔" ان حالات میں مذہب حق و حضرات اکابر سے ہماری وابستگی اور وفاداری کا تقاضا ہے کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے حالات وواقعات کو سامنے رکھ کر باہم متحد و متفق ہو کر راہ عمل متعین کریں۔ اسی ضرورت کے تحت تحفظ سنت کے عنوان سے حضرات علماء و دانشوانِ قوم و ہمدردانِ ملت کا ایک ملک گیر اجتماع ۲۔۳ مئی ۲۰۰۱ء کو نئی دہلی میں ہوگا۔ جناب عالی کی ملی حمیت سے یہ توقع ہے کہ اس اہم اجتماع میں ضرور شریک ہوں گے۔" داعی کانفرنس کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ وہ اہل حدیث مسلمانوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس موقع پر ۲۹/کتابوں کا ایک سیٹ بھی تقسیم ہوا جس میں علمائے دیوبند کا بھرپور دفاع اور اہل حدیث علماء کے خلاف متشددانہ جارحیت کا انداز واسلوب کارفرما تھا۔ مقررین نے انتہائی جارحانہ تقریریں بھی کیں اور آخر میں اسی طرح کی قراردادیں بھی منظور ہوئیں جن میں اہل حدیث علماء کا گویا حقہ پانی بند کرنے کی سفارش کی گئی۔ اس کے تین سال بعد ایک اہل حدیث عالم مولانا محمد رئیس ندوی نے "دیوبندی تحفظ سنت کانفرنس"، لکھی اور" دیوبندی مجموعۂ کتب پر سلفی تحقیقی جائزہ" پیش کیا۔ جو بڑی تقطیع پر ۸۳۷ صفحات پر مشتمل ہے یہ ردعمل گویا جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم کے اس شعر کا مصداق ثابت ہوا

الا لا یجھلن أحد علینا ‏ ‏ ‏ ‏ فنجھل فوق جھل الجاھلینا

دیکھئے کتاب مذکور مطبوعہ مرکز الدعوۃ الاسلامیۃ والخیریۃ، رتنا گیری مہاراشٹرا، جولائی ۲۰۰۴ء بعنوان "دیوبندی تحفظ سنت کانفرنس پر سلفی تحقیقی جائزہ۔

(۸) منشی عبدالرحمٰن، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ملتان، ص ۹۶

(۹) رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ، مرادآباد، ۱۹۰۶ء، ج ۲ ص ۹، ۵، ۹۵۔ ۹۸

(۱۰) نفس مصدر، ج۱،ص ۲۰۵

(۱۱) دارالعلوم دیو بند، نقل کتاب تحریری اہل مشورہ ۱۸۹۲ء کا اندراج ص ۹۳۔۹۵،

منقول از: Barbara Daly Metcalf Islamic Revival In British India: Deoband, 1860-1900, princeton,1982, P. 144.

سر سید احمد خاں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کو بنیادی شکایت یہی تھی کہ انھوں نے فقہ اسلامی کے چار ماخذ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کو وہ مقام نہیں دیا جو تاریخ اسلامی میں طے شدہ تھا اور تقلید شخصی کی راہ چھوڑ کر اجتہاد کا منہج اپنایا۔ اور ''کلام خداوندی'' اور ''تخلیق خداوندی'' کے درمیان کامل ہم آہنگی کا فلسفہ تراشا جو دراصل ان کی مبہم عقلیت کا شاخسانہ تھا۔ دونوں بزرگوں کی باہمی مراسلت کے لئے دیکھئے ''تصفیۃ العقائد'' جو دیو بند سے طبع ہو چکی ہے۔

(۱۲) محمد رفیع، دارالعلوم دیو بند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ دہلی، ۱۹۱۶ء ص ٦

(۱۳) رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ: ج۱،ص: ۵۰، ۸۹، ۱۴

(۱۴) عبدالحیٔ، دہلی اور اس کے اطراف، لکھنؤ، ۱۹۵۸ء ص ۱۴۷۔۱۴۸

(۱۵) فتاوی رشیدیہ ج ۳ ص ۳۸

(۱٦) نفس مصدر ص ۲۵

(۱۷) نفس مصدر، ج ۲ ص ۱۱۔۱۳

(۱۸) شاہ عبدالعزیز دہلوی، فتاویٰ عزیزی، دہلی، ۱۳۱۱ھ، ج۱ ص ۱۹۹

(۱۹) فتاویٰ رشیدیہ، ج ۳، ص: ۲۰

(۲۰) تفصیل کے لئے دیکھئے:

Muhammad Khalid Masud, Trends in the Interpretation of Islamic law as reflected in the Fatwa Literature of Deoband School, A Studay of the Attitudes of the Ulama of Deoband to Certain Social problems and Invention , M.A Thesis, Institute of islamic studies , Mc Gill University 1969, pp. 61-62 as quoted in Metcalf , op. Cit, p. 154.

(۲۱) محمد عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، میرٹھ ج ۲، ص ۱۰۵۔۱۱۱

(۲۲) محمد طیب قاسمی، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، دیوبند، ۱۹۶۸ء، ص ۲۴

(۲۳) محمد یعقوب نانوتوی، مکتوبات یعقوبی و بیاض یعقوبی، تھانہ بھون، ص ۲۴

(۲۴) اس مناظرہ پر مکمل بحث اور عیسائیوں کے ردِّ عمل کے مطالعہ کے لئے دیکھئے:

A.A. Powell, " Maulana Rahmat Allah Kairanwi and Muslim - Christian Controvesy in India in the mid 19th Century" Journal of the Royal Asiatic Society , 1976. pp. 54,57.

(۲۵) متکاف، حوالہ بالا، ص ۲۲۱

(۲۶) مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، جلد ۲، ص ۳۵۳

(۲۷) محمد قاسم نانوتوی، مباحثۂ شاہجہاں پور، دیوبند ص ۴

xxxxxxxxxxxxxxxxxx

باب سوم

سلفی مدارس

نصب العین:

سلفی مکتب فکر، جو اہل حدیث کے نام سے معروف ہے، دراصل کتاب وسنت کے اتباع اور تقلید شخصی و بدعت سے اجتناب کی دعوت کا علم بردار ہے۔ یہ قرآن کریم اور احادیث رسول کو اسلامی شریعت کا مصدر قرار دیتا ہے۔ ائمہ کرام کی تقلید کے بجائے اطاعت رسول پر زور اس قدر ہے کہ فقہائے کرام کی ذاتی رائے اور اجتہاد کو درخود اعتنا نہیں سمجھتا (۱)۔ یہ مکتب فکر ہر حال میں قول رسول کو ترجیح دیتا ہے خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو، علمائے اہل حدیث اولیاء اللہ سے عقیدت ومحبت تو رکھتے ہیں مگر ولایت کو پیشہ تصور نہیں کرتے بلکہ اس کا مدار ایمان وتقویٰ پر رکھتے ہیں (۲)۔ اس مکتب فکر کے علم بردار اپنی خصوصیات وہی بتاتے ہیں جو عام خداترس مسلمانوں کی قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہیں۔ یعنی (۱) توحید خالص کی پیروی (۲) سنت رسول کا اتباع (۳) تزکیہ نفس (۳)۔ یہ اپنے کو ''اہل سنت و جماعت'' ہی تصور کرتے ہیں، الگ سے کوئی فرقہ یا مکتب فکر نہیں باور کراتے مگر اسی فکر کے علم برداروں کو '' طائفة منصورة'' اور'' طائفة ناجية'' گردانتے ہیں (۴)۔

مذہب سلف سے مراد ان علماء کے نزدیک ''وہ طریقہ ہے جس پر صحابہ کرام، تابعین عظام، اتباع تابعین اور بعد میں آنے والے وہ ائمہ دین گامزن تھے جن کا تدین اعلی درجہ کو پہنچا ہوا تھا۔ اور جن کی امامت امت کے نزدیک مسلم ہے اور جن کے اقوال وافعال لوگوں کے نزدیک مقبول ہیں۔'' اور امامانِ سلف کی پیروی کا مطلب ہے ''اپنے آپ کو کسی ایک شخصیت کا پابند بنائے بغیر کتاب وسنت سے جن مسائل واحکام کو سلف نے سمجھا اور مستنبط کیا ہے انہیں اختیار کرنا۔ عقیدہ وسلوک، عبادات ومعاملات غرض تمام دینی امور میں بالخصوص ان امور میں جو بعد میں چل کر غیر اسلامی تاثیرات کا شکار ہو کر مختلف فیہ مسائل بن گئے، ان کے افکار ونظریات، آراء واقوال نہ صرف تسلیم کرنا بلکہ کتاب وسنت کا فہم حاصل کرنے کے لئے انہیں مشعلِ راہ بنانا، عملی زندگی میں ان کے طور طریق کو اپنانا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا (۵)۔

تصنیفی خدمات:

برصغر ہندو پاک میں اس مکتب فکر کا سررشتہ تحریک شہیدین اور خاص طور سے شاہ اسماعیل شہید (م ۱۸۳۱ء) سے ملتا ہے جن کی شاہکار تصنیف ''تقویۃ الایمان'' نے شرک جلی و خفی کی تمام رسموں اور اوہام وخرافات پر اور بدعت کی تمام مروجہ صورتوں پر ضرب کاری لگائی۔ اور توحید خالص کی بے آمیز دعوت پوری جرأت وصراحت سے دی۔ بعد کے نامور اساطین میں سید نواب محمد صدیق حسن خاں بھوپالی (۱۸۳۲ء۔ ۱۸۹۰ء) شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی (۱۱۹۲ء۔۱۲۶۲ھ) ، محمد فاخر زائر الہ آبادی (۱۱۲۰۔ ۱۱۶۴ھ) ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۵۹ھ)، میاں نذیر حسین محدث دہلوی (۱۸۰۵۔۱۹۰۲ء)، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی (م ۱۳۳۴ھ) ، عبد اللہ محدث غازی پوری (م ۱۳۳۷ھ)، مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری (۱۲۸۳۔۱۳۵۳ھ)، شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی مبارک پوری (۱۳۲۷۔۱۴۱۴ھ)، فاتح قادیان ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری (۱۸۶۸۔ ۱۹۴۸ء) مولانا محمد جونا گڑھی (۱۸۹۰۔۱۹۴۱ء) وغیرہ علماء ومحدثین شامل ہیں جنھوں نے درس وتدریس، دعوت وتبلیغ اور مناظرہ ومباہلہ کے مختلف میدانوں میں اس دعوت اور فکر سلف کی بھرپور ترجمانی کی۔ تحریر وصحافت اور تحقیق وتصنیف کے میدانوں میں بھی علماء اہل حدیث کی خدمات قابل فخر ہیں۔ یادگار مجلہ اہل حدیث (اٹھائیسویں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس پاکوڑ ۲۰۰۴ء) نے تفسیر قرآن کے موضوع پر اہل حدیث علماء کی ۱۱۶ تحقیقات کی مختصر فہرست شائع کی ہے۔ یہ کتابیں دراصل وہ تفسیری تصنیفات ہیں جو قرن کریم کی مکمل نامکمل یا کسی ایک پارہ یا چند پاروں کی راست تشریح وتفہیم پر مشتمل ہیں۔ اس فہرست میں علوم قرآنی کے مختلف موضوعات پر شائع کتابیں شامل نہیں ہیں۔ (ص: ۱۰۹۔ ۱۱۲) مولانا محمد مستقیم سلفی نے اپنے ایک مقالہ میں تدوین سنت اور علوم حدیث کے موضوعات پر ۳۹ سلفی تحقیقات کی مکمل فہرست پیش کی ہے (۶)۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ملک کے مختلف خطوں سے شائع ہونے والے ان اخبارات ورسائل کی تعداد کم از کم ۹۸ ہے جو آسمان صحافت پر طلوع ہو کر ایک مدت تک روشنی بکھیرنے کے بعد اب غروب ہو چکے ہیں۔ اردو، عربی، ہندی، بنگلہ، گجراتی اور ملیالم زبانوں میں ہنوز جاری رسائل وجرائد اور اخبارات کی تعداد کم وبیش اکتالیس ہے یہ سب دینی وعلمی اور اخلاقی ومعاشرتی مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۱۹۹۲ء کے ایک تحقیقی جائزہ (۷) سے معلوم ہوا کہ زمانہ شاہ اسماعیل شہید سے اس وقت تک کے علمائے اہل حدیث کی تصانیف کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زائد ہے خود مصنف کے بقول یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ اس کی حیثیت محض جلد اول کی ہے۔ اس سروے میں غالباً ان اہل حدیث مصنفین کی تحقیقات شامل نہیں ہیں جو دوسری تحریکوں اور جماعتوں کے کارکن اور ان سے منسلک ہیں۔ اس جائزہ میں بیس فصلیں ہیں اور ہر فصل علوم اسلامیہ کے کسی ایک مضمون سے متعلق ہے۔ اس جائزہ کے سرسری مطالعہ ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مکتب فکر نے کیسا عظیم الشان علمی و تصنیفی ورثہ چھوڑا ہے۔

اہل حدیث علماء نے اجتماعیت اور تنظیم کی سخت ضرورت محسوس کرتے ہوئے ''دعوت توحید، احیائے اسلام، کتاب وسنت کی تبلیغ، افکار محدثین کی ترویج، کفر وشرک، بدعات وخرافات اور تقلید و جمود کے قلع قمع کے لئے۔'' ۶ ذی قعدہ ۱۳۲۴ھ/۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) کے سالانہ مذاکرہ علمیہ کے موقع پر ''آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس'' کی بنیاد رکھی (۸)۔ اس مرکزی نظم کے پہلے صدر حافظ عبداللہ غازی پوریؒ، ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، خازن بیت المال مولانا شمس الحق ڈیانویؒ (م ۱۹۱۱ء) کو منتخب کیا گیا اور صدر دفتر دہلی میں قائم کیا گیا۔ تقسیم ملک کے بعد جب حالات ذرا قابو میں آئے تو ۱۸۔۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء کو دہلی میں کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں اسے ''مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند'' کے نئے نام سے موسوم کیا گیا۔ جن علماء واکابر نے صدر اولین کے بعد مرکزی نظم کی صدارت وامارت کی ذمہ داری نبھائی وہ بالترتیب اس طرح ہیں: ضمیر الدین احمد لوہارو (م ۱۹۴۳ء)، مولانا احمد حسن دہلوی (م ۱۹۲۰ء)، عبدالغفار دہلوی (م ۱۹۳۸ء)، الحاج عبدالرحمٰن دہلوی، الحاج محمد صالح (۱۸۸۳۔۱۹۷۳ء)، عبدالوہاب آروی (م ۱۹۸۴ء)، ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی (۱۹۱۶۔۱۹۹۹ء)، عبدالوحید سلفی (۱۹۲۴۔۱۹۸۹ء)، مولانا مختار احمد ندوی (پیدائش ۱۹۳۰ء)، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری (پیدائش ۱۹۴۳ء) اور حافظ محمد یحیی دہلوی (پیدائش ۱۹۲۵ء)۔

تدریسی خدمات:

تحریک اہل حدیث نے برصغیر میں مکاتب ومدارس کا ایک جال بچھا دیا اور انیسویں صدی میں سرگرم عیسائی مشنری تحریکوں اور ہندو احیائی جماعتوں کے منفی وتخریبی لٹریچر کے اثر سے

مسلمانوں کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تقسیم ملک سے قبل کی تاریخ میں دارالحدیث رحمانیہ (۱۹۲۱۔ ۱۹۴۷ء) کا حصہ اہل حدیث مدارس کی فہرست میں سب سے نمایاں ہے۔ اس مدرسہ کا سنگِ بنیاد دہلی کے مشہور تاجر الحاج عبدالرحمٰن (م ۱۹۲۱ء) اور ان کے چھوٹے بھائے شیخ عطاء الرحمٰن (م ۱۹۳۸ء) نے شوال ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں باڑا ہندو راؤ دہلی میں رکھا۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (م ۱۳۷۵ھ) نے بعد میں اپنے مدرسہ ''دارالحدیث'' کا نام مع کتب خانہ اساتذہ وطلبہ دہلی کی اس نئی عمارت میں منتقل کردیا۔ دونوں بھائیوں کے ناموں کے آخری لفظ ''رحمٰن'' کی مناسبت سے اس مدرسہ کے نام میں رحمانیہ کا بھی لفظ جڑ گیا۔ اس مدرسہ میں ادنیٰ سے عربی کی آٹھویں جماعت تک معقول ومنقول کی ٹھوس تعلیم ہوتی تھی۔ طلبہ کو بعد نماز عصر کشتی اور بنوٹ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسہ کا ترجمان ماہنامہ ''محدث'' مولانا عبدالحلیم ناظم صدیقی کی ادارت میں نکلا پھر مولانا نذیر احمد املوی اس کے مدیر بنے۔ تقسیم ملک کے نتیجہ میں اس وقت کے مہتمم شیخ عبدالوہاب مع اہل خانہ کراچی ہجرت کرگئے اور یہ مدرسہ بند ہوگیا۔

جامعہ سلفیہ:

آزاد ہندوستان میں رجب ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء میں سعودی سفیر برائے ہند یوسف بن عبداللہ الفوزان کے بدست قائم ہونے والا ادارہ مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ بنارس ہندو پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر عالم اسلام میں بھی معروف ومقبول ہوا۔ مقاصد جامعہ میں

(ا) علوم اسلامی وعربی کے ساتھ مقامی وعالمی زبانوں کی تعلیم

(ب) شرک وبدعت اور مخالف دین، رسم ورواج کے خلاف جدوجہد اور بداعتقادی اور اوہام پرستی سے مسلم معاشرہ کی تطہیر

(ج) مخالفین اسلام کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دینے کے لئے بالغ نظر اور مخلص علمائے دین کی تیاری

(د) علمی ودینی سرمایہ کا تحفظ اور زبان عربی کے فروغ کے لئے ترغیب وتحریض کو اولیت دی گئی (۹)

ایسا نصاب تعلیم رائج ہوا جس میں بنیادی مضامین توحید، تفسیر، حدیث، تاریخ، عربی زبان وغیرہ پر خاص توجہ دی گئی تاکہ فارغ طلبہ کتاب وسنت پر مبنی عقیدہ وعمل کا نمونہ بنیں اور عصر

حاضر کے فتنوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آگے چل کر ۱۹۸۱ء میں مؤتمر الدعوة والتعلیم کے انعقاد کے موقع پر مسرت ظاہر کی گئی کہ سلفی طلبہ جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم ہیں، امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہورہے ہیں اور بسا اوقات عرب طلبہ پر مسابقت بھی حاصل کررہے ہیں (۱۰)۔ جامعہ سلفیہ نے اپنے مراحل تعلیم کو ابتدائی، ثانوی، درجات عالمیت فضیلت اور شعبۂ حفظ وتجوید قرآن میں تقسیم کیا۔ صالح لٹریچر کی تیاری کے لئے ادارۃ البحوث الاسلامیۃ کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا جس نے عربی زبان میں ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری (پیدائش ۱۹۳۹ء) کی ادارت میں ۱۹۶۹ء سے ماہنامہ صوت الامۃ (۱۱)، اور اردو زبان میں ۱۹۷۳ء سے مولانا اویس آزاد رحمانی کی ادارت میں صوت الجامعہ نکالنا شروع کیا جو آگے چل کر ''محدث'' کے نام سے موسوم ہوگیا (۱۲)۔ ۱۹۸۱ء تک ادارۃ البحوث الاسلامیہ نے مختلف زبانوں میں تیس کتابیں شائع کیں (۱۳)۔

اس مکتب فکر کے دوسرے ممتاز مدارس میں درج ذیل کافی معروف ہیں:

جامعہ اسلامیہ فیض عام جو ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں مئوناتھ بھنجن میں مولانا محمد احمد معروف بہ بڑے مولوی صاحب کے ذریعے قائم ہوئی۔

جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو کی تاسیس ۱۹/جون ۱۹۵۴ء کو مولانا محمد عبداللہ الشائقؒ کے ذریعہ عمل میں آئی۔

جامعہ اسلامیہ خیر العلوم کا قیام مولانا محفوظ الرحمٰن اور ڈاکٹر عبدالباری خان اور دوسرے رفقاء کے ذریعے ڈومریا گنج سدھارتھ نگر میں ہوا۔

کلیۃ الصفا للشریعۃ الاسلامیۃ کو مولانا عبدالواحد مدنی نے ۱۹۹۲ء میں ڈومریا گنج سدھارتھ نگر میں قائم کیا۔

طالبات کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے مولانا مختار احمد ندوی نے کلیۃ فاطمۃ الزہراء مئو میں قائم کیا جس کے ناظم مولانا اکرم مختار اور پرنسپل شیخ میمونہ ادریس ہیں۔

کونڈ و بونڈیہار بلرام پور میں مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوریؒ کے ہاتھوں جامعہ سراج العلوم کا قیام ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں عمل میں آیا جس کے ناظم اس وقت مولانا احسان اللہ خان ہیں۔

۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں مئو کی سرزمین میں مولانا فیض اللہ مئوی نے جامعہ عالیہ عربیہ قائم کیا۔اس وقت ناظم مولانا مظہر احسن ازہری ہیں۔

بہار میں ڈاکٹر محمد لقمان سلفی نے مدینۃ السلام مشرقی چمپارن میں ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء میں جامعہ ابن تیمیہ قائم کیا جس کے ناظم مولانا ارشد فہیم ہیں۔اس ادارہ نے جلد ہی بڑے بڑے علمی منصوبے نافذ کر لئے ہیں۔

کشن گنج بہار میں توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ نے ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء مین جامعۃ البخاری قائم کیا جس کے مدیر مولانا عبدالمتین سلفی ہیں۔

لہریا سرائے دربھنگہ میں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کی تاسیس 1918ء میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے ہاتھوں عمل میں آئی جس کے ناظم ڈاکٹر عبدالحلیم سلفی ہیں۔

دہلی میں جامعہ ریاض العلوم السّلفیہ کو مولانا عبدالسلام بستوی نے قائم کیا جو اس وقت مولانا عبدالرشید ازہری کی نظامت میں مصروف عمل ہے۔

۱۹۸۰ء میں مرکز ابوالکلام آزاد للتوعیۃ الاسلامیۃ نے جامعہ اسلامیہ سنابل قائم کیا جس کے ناظم مولانا عبدالحمید رحمانی ہیں۔یہ ادارہ ملک کے طول وعرض میں تیس مکاتیب ومدارس کی سرپرستی کررہا ہے۔

مالیگاؤں مہاراشٹر میں ۱۹۷۸ء میں الحاج سیٹھ محمد خلیل انصاری اور مولانا مختار احمد ندوی نے جامعہ محمدیہ قائم کیا۔

عمر آباد ضلع ویلور تمل ناڈو میں کاکا محمد عمر اور کاکا بہاء الدین نے ۱۹۲۴ء میں جامعہ دارالسلام قائم کیا جس کے اس وقت ناظم کاکا محمد سعید عمری ہیں۔اس ادارہ نے اعتدال وتوازن اور توسع کی بہترین مثال قائم کی اور نومسلم افراد کی تعلیم وتربیت کا منصوبہ بھی نافذ کر رکھا ہے۔

ان مدارس نے کم وبیش علوم منقولہ ومعقولہ کی وہی کتابیں شامل نصاب کیں جو دارالحدیث رحمانیہ میں زیر درس تھیں تاہم بعض امتیازات بھی اس میدان میں قائم ہوئے۔جامعہ سلفیہ نے آگے چل کر کمپیوٹر ٹریننگ کا بندوبست بھی کیا۔کلیۃ الصفا نے ادیان ومذاہب کے مطالعہ کے مضمون پر بھی توجہ دی۔جامعہ اسلامیہ خیر العلوم نے خیر ایجوکیشنل اور ٹیکنیکل سینٹر بھی قائم کیا اور بیشتر مدارس وجامعات نے انگریزی وہندی کی ثانوی درجہ کی تعلیم کو شامل درس کیا۔

انکار حدیث کے خلاف معرکہ آرائی:

ان تمام مدارس کا زور ردّ بدعات و خرافات اور تقلید شخصی کے خلاف رہا ہے۔ اہل حدیث علماء اور اداروں کی خدمات علمی کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے تردیدی و دفاعی لٹریچر کی تیاری پر اپنی بیشتر صلاحیتیں مرکوز کی ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ (م ۱۹۶۸ء) نے تحریک انکار حدیث کے تدریجی ارتقا کا ایک جدول مرتب کیا ہے۔ وہ ۱۳۰۰ھ میں احادیث کا بالکلیہ انکار کرنے والوں میں مولوی عبد اللہ چکڑالوی، مستری محمد رمضان، مولوی حشمت علی لاہوری اور مولوی رفیع الدین ملتانی وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔ ۱۴۰۰ھ میں برسر تصنیف و تحقیق مولوی احمد دین اور غلام احمد پرویز کو ان منکرین حدیث میں شمار کرتے ہیں جن کے نزدیک قرآن وحدیث ایک کھیل یا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی نظریہ ہے۔ چودھویں صدی میں مولانا شبلی نعمانی ،مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کو اور سید سلیمان ندوی کے سوا عام فرزندان ندوہ کو اس طبقہ میں شمار کرتے ہیں جن کے انداز فکر سے حدیث کا استخفاف واستحقار معلوم ہوتا ہے اور جن کے طریق گفتگو سے انکار حدیث کے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ مولانا اسماعیل گجرانوالہ نے مولوی چراغ علی اور سر سید احمد خاں وغیرہ کو نیچری اور مغربی تہذیب سے مرعوب قرار دیا ہے (۱۴)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد کے علماء اہل حدیث نے اسی جدول کے مطابق اپنا تردیدی ودفاعی لٹریچر تیار کیا۔

مولانا مودودیؒ کی فکر کی تردید میں مولانا عبداللہ روپڑیؒ (۱۳۰۳۔۱۳۸۴ھ) نے "مودودیت اور احادیث نبویہ" تحریر کی۔ مولانا داؤد رازؒ (م ۱۴۰۲ھ) نے اپنی دو کتابوں" مسلک اہل حدیث" اور "تحریک جماعت اسلامی کا پس منظر" میں اپنے اختلافات کو بیان کیا ہے۔ مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ نے "جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث" میں مولانا مودودی کی تصانیف "تفہیمات" اور "مسلك اعتدال" کا رد کیا ہے۔ مولانا محمد احمد گوندلویؒ (۱۸۹۹۔۱۹۸۵ء) کی تصنیف "تنقید المسائل" مولانا محمد سلیمان مئویؒ (۱۳۱۶۔۱۳۹۸ھ) کی کتاب 'تحقیق مسئلہ دجال' مولانا عبدالمبین منظرؒ (۱۹۲۱۔۱۹۸۹ء) کی ' نیا مذہب فکر"، صوفی نذیر احمد کاشمیریؒ (۱۹۰۴۔۱۹۸۵ء) کی کتابیں "جماعت اسلامی کے دین کا خلاصہ"، واحد طریق عمل"، "حقیقت دین" اور "تطہیر فکر اسلامی"

مولانا احمد علی بنارسی کی امارت وصحابیت، حافظ صلاح الدین یوسف کی،'' **خلافت و ملوکیت کی شرعی حیثیت** '' ،مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ کی ' **خطاب به مودودی** '' ،حکیم اجمل خاں کی ''جماعت اسلامی کو پہچانئے'' اور حکیم مولانا ابوالحسن عبیداللہ رحمانی (م۲۰۰۴ء) کی کتاب ''اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام'' وغیرہ تمام نگارشات میں مولانا مودودی کی فکر اور جماعت اسلامی کو نشانۂ تنقید بنایا گیا۔

مولانا ظہیر حسن شوق نیمویؒ (م۱۳۲۲ھ) کے افکار کی تردید میں چند اکابر پیش پیش رہے۔مولانا محمد سعید محدث بنارسی (م۱۹۰۴ء) نے درج ذیل کتب تصنیف کیں۔

[۱] السکین لقطع حبل المتین

[۲] سیف المؤحدین علی عنق رد السکین

[۳] الردّ لردّ الردّ مع ابداء العرة لمؤلف القرة

[٤] ازالة الشین عن جلاء العین

[٥] ردّ الترديد الى اهل التقليد مع قرة العين بردّ ما وقع فى ضياء العين

مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی (م۱۳۵۲ھ۔۱۹۰۴ء) نے مولانا نیموی کی تردید میں درج ذیل تحریریں ترتیب دیں۔

[۱] مطلع القمرين فى تائيد رفع اليدين

[۲] المذهب المختار فى الردّ على جامع الآثار

[۳] التعقيب الحسن على المولوى ظهير حسن

[٤] الجواب الأحسن عن الكلام المحتحسن

[٥] افادات الحنفاء فى الكذابين والضّعفاء

[٦] الرّسالة العادلة فى رّد المقالة الكاملة

[۷] الجواب السّديد عماّ أو رده فى اوشحة الجيد

[۸] تقوية الحديث بجواب انكار الحديث

[۹] جوابات منکرین

مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری (۱۲۸۳۔۱۳۵۳ھ) نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور علمائے احناف بالخصوص مولانا نیموی کے دلائل پر احادیث رسول کی روشنی میں تنقید کی۔ اردو میں ''اعلام اهل الزمن من تبصرة اهل السنن'' اور عربی میں ''ابکار المنن فی تنقید آثار السنن'' دراصل مولانا نیموی کی تصنیف ''آثار السنن'' کے جواب میں ہے۔

ملاّ عبدالکریم عمر پٹنوی (م ۱۹۲۲ء) کی تحریروں کے رد میں مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (۱۳۰۷۔۱۳۶۹ھ) نے درج ذیل کتب شائع کیں:

[۱] حلّ مشکلات البخاری مسمی بالکوثر الجاری فی جواب الجرح علی البخاری (تین جلدیں)

[۲] الأمر المبرم لابطال الکلام المحکم

[۳] ماء حمیم للمولوی عبد الکریم

[۴] صراط مستقیم لهدایه عمر کریم

[۵] الریح العصیم لحسم بناء عمر کریم

[۶] الخزی العظیم للمولوی عمر کریم

[۷] العرجون القدیم فی افشاء هفوات عمر کریم

مولانا محمد اسلم جیراج پوری (م ۱۹۵۵ء) کی نگارشات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سیاق میں مولانا عبدالصمد حسین آبادی (۱۳۲۲۔۱۳۶۷ھ) کا نام اہم ہے جنھوں نے ''شرف حدیث'' اور ''شان حدیث'' میں مولانا جیراج پوری کے خیالات کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ آپ کی ایک تحقیق ''تائید حدیث'' بجواب ''تنقید حدیث'' ابھی مخطوطہ ہی کی شکل میں ہے اس کا موضوع بھی مولانا جیراج پوری کے نظریات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس ضمن میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی کتاب ''دفاع عن الحدیث'' اور مولانا محمد سورتیؒ (۱۲۵۶۔۱۳۱۵ھ) کی تصنیف ''عالم برزخ'' بھی قابل ذکر ہیں۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی کے نظریات واعتقادات کی تردید میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی خدمات اہم ہیں۔ خاص طور سے ان کی کتاب ''دلیل الفرقان" بجواب "اهل القرآن" ناقابل فراموش ہے۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ (۱۲۹۵۔۱۳۷۵ھ) کا اس اہل قرآن عالم سے مناظرہ بھی لائق مطالعہ ہے جو اسی نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مولوی احمد الدین امرتسریؒ نے

اس کی تحریروں کا بھی تعاقب کیا اور اس ضمن میں " برهان القرآن " اور برهان الحديث بأحسن الحديث " نامی کتابیں شائع کیں۔ایک اور کتابچہ '' حجیت حدیث اور اتباع الرسول " بھی اسی موضوع پر ہے۔ یہ مولوی احمد الدین اور مولانا امرتسری کے درمیان مناظرہ کی رپورٹ ہے۔ مولانا امرتسری نے خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۸۔ ۱۹۶۳ء) کی تردید میں بھی ایک کتاب لکھی جو '' خاکساری تحریک اور اس کا بانی '' کے نام سے شائع ہوئی۔ معروف مصنف غلام جیلانی برق کے نظریات بھی ان علماء کی تنقیدوں کی زد میں آئے۔ مولانا محمد داؤد رازؒ نے '' خالص اسلام '' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی اور '' برق کے دو اسلام پر '' تنقید کی۔ مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈا نگریؒ (م ۱۹۹۹ء) نے اس سیاق میں دو جلدوں پر مشتمل '' صیانۃ الحدیث '' تحریر کی اور احادیث نبویہ کی روشنی میں برق کے افکار کی تردید کی۔

مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۹/۱۸۴۰۔۱۹۰۸ء) کی تحریروں، مساعی اور تحریکوں کے خلاف مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اتنی بھرپور جدوجہد کی اور تحریری میدان میں اور پیہم مناظروں اور مباحثوں کے ذریعہ اس قدر عظیم الشان دینی خدمات انجام دیں کہ انھیں '' فاتح قادیان '' کا خطاب ملا۔ ان کے علاوہ مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا عبد اللہ معمار، مولانا محمد شریف گھڑیالوی، مولانا عبد الرحیم لکھوکے، مولانا حافظ عبد اللہ روپڑی، مولانا حافظ محمد گونڈوی، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ، مولانا محمد حنیف ندوی، بابو حبیب اللہ اور حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری وغیرہ علماء واکابر نے قادیانیوں کو ہر محاذ پر للکارا اور انھیں شرمناک شکست دی۔ علماء اہل حدیث نے اس موضوع پر جو کتابیں، رپوتاژ اور تبصرے شائع کیے ان کی تعداد لگ بھگ ڈیڑھ سو ہے (۱۵)۔

دفاع دین:

آریہ سماجی تنظیموں اور عیسائی مشنریوں کے تحریری اعتراضات اور الزامات کو بھی علماء اہل حدیث نے چیلنج کیا اور ان کے جواب میں متعدد کتابیں شائع کیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کا یہ خصوصی میدان تھا۔ انھوں نے سوامی دیانند کے جواب میں '' حق پرکاش '' بجواب '' ستیارتھ پرکاش '' لکھی۔ ماسٹر آتما رام ایڈیٹر '' رام مسافر '' سے مناظرہ کیا اور اسے '' الہامی کتاب '' کے عنوان سے شائع کیا۔ مہاتما دھرم پال کی کتاب '' تہذیب الاسلام '' کے جواب میں ۴ جلدوں پر

مشتمل ''تغلیب الاسلام'' کتاب لکھی۔ پادری ٹھاکر دت کے رسالہ ''عدم ضرورت قرآن'' کی تردید میں رسالہ ''تقابل ثلاثہ'' لکھا۔ پادری سلطان محمد پال کی تفسیر کی رد میں آپ نے "برھان التفسیر برائے اصلاح سلطان التفسیر" رقم کی۔ پنڈت دھرم بھکشو آریہ کے اعتراضات کا جواب "کتاب الرحمن" میں دیا۔ ایک دوسرے عالم مولانا عبدالغفور دانا پوری (۱۲۶۹۔۱۳۰۰ھ) نے بھی ایک گمنام پادری کے رسالہ ''فرقان کا بیان'' کی تردید میں "اللمعان لصاحب الفرقان" لکھا۔

اس پورے تردیدی لٹریچر کو اہل حدیث ''دفاعی اقدامات سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ بحث ومناظرہ کے لئے پیش قدمی جماعت اہل حدیث کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ لیکن جب بھی اسلام کے خلاف کوئی نظری وفکری فتنہ سر اٹھائے تو اس کی سرکوبی کو وہ اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں اور اس سے صرف نظر کو ایمانی غیرت وحمیت کے منافی خیال کرتے ہیں۔ ان علماء نے نظری وفکری فتنہ کی فہرست میں سناتن دھرمیوں، آریہ سماجیوں، قادیانیوں، عیسائیوں، رافضیوں، بہائیوں، اباحیت پسندوں، دہریوں، نیچریوں، معتزلیوں، خارجیوں، قدریوں، بریلویوں، اور لا مذہبوں (۱۶) کو شامل کیا اور ان کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ آج بھی ان کی تحریروں اور تقریروں کا ہدف عام طور پر یہی گروہ ہیں اور علماء اہل حدیث اس میدان میں پیش پیش ہیں۔

xxxxxxxxxxxxxxxxx

تعلیقات وحواشی:

(۱) یادگار مجلّہ اہل حدیث، ترتیب اصغر علی امام مہدی سلفی، اور خالد حنیف صدیقی فلاحی دہلی، ۲۰۰۴ء، مطیع اللہ حقیق اللہ مدنی کا مقالہ ''مسلک اہل حدیث اور اس کی امتیازی خصوصیات'' ص:۳۷، تقلید شخصی کی مختلف اقسام اور ان کے جواز وعدم جواز پر اہل حدیث علماء کی رائے کے لئے دیکھئے میاں نذیر حسین محدث دہلوی کی کتاب'' معیار الحق '' احمد الدہلوی کی تصنیف، ''تاریخ اہل حدیث'' لاہور، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۳ء

(۲) دیکھئے نفس مصدر، ص ۳۵

(۳) دیکھئے نفس مصدر، ص ۳۵۔۳۸

(۴) نفس مصدر، مضمون فرقہ ناجیہ کون؟ ص، ۴۷۔۴۸

(۵) نفس مصدر، ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری کا مضمون ''سلف اور سلفیت''، 'تجزیہ وتعارف'' ص ۲۵

(۶) مولانا محمد مستقیم سلفی کا مقالہ ''علماء اہل حدیث ہند کی خدمات حدیث''، ''در علوم الحدیث'' مطالعہ وتعارف'' ترتیب رفیق احمد رئیس سلفی، علی گڑھ ۱۹۹۹ء، (مجموعہ مقالات سیمینار منعقدہ ۱۸/۱۹/۱۱ کتوبر ۱۹۹۸ء) ص ۴۴۴۔۴۷۷

(۷) مولانا محمد مستقیم سلفی، جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات، بنارس، اشاعت دوم، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء، اشاعت اول جامعہ سلفیہ بنارس کی دعوت وتعلیم کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۰ء کے موقع پر منظر عام پر آئی تھی جس میں جامعہ سلفیہ کے بعض دیگر اساتذہ کا تعاون بھی شامل تھا۔ دوسری اشاعت کا پورا مسودہ موجودہ مرتب ہی کا ترتیب کردہ ہے۔ (ص، مقدمہ، ن) دوماہی الصفا علی گڑھ کے مدیر نے بھی اس کتاب کے بعض اہم نقائص کی نشاندہی کی ہے۔ دیکھئے الصفا ج۱، شمارہ ۵، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ۵۶۔۶۲

(۸) یادگار مجلّہ اہل حدیث، ص ۲۳۰

(۹) مجلۃ الجامعۃ السلفیۃ کا مؤتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر، بنارس، ۱۹۸۱ء، ص ۵۵

(۱۰) نفس مصدر ص ۵۶

(۱۱) یہ رسالہ پہلے جامعۃ السلفیہ کے نام سے جاری ہوا مگر بعض قانونی رکاوٹوں کی وجہ

سے جولائی ۱۹۸۶ء سے "نشرۃ" کے نام سے شائع ہونے لگا اور مارچ ۱۹۸۸ء سے "صوت الامۃ" کے نام سے برابر خدمتِ ادب وصحافت میں مصروف ہے۔

(۱۲) آگے چل کر یہ سہ ماہی رسالہ ماہنامہ محدث کی شکل میں تبدیل ہو گیا جو ۱۹۸۲ء میں مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری (پیدائش ۱۹۴۳ء) کی ادارت میں نکلا۔ ستمبر ۱۹۸۶ء سے اگست ۱۹۸۷ء تک اس کی اشاعت موقوف رہی۔ دوبارہ مولانا مبارک پوری ہی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اب اس کے مدیر مولانا عبدالوہاب حجازی ہیں۔

(۱۳) مؤتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر شائع شدہ تعارف

(۱۴) یادگار مجلّہ اہل حدیث، ص ۱۴۱۔۱۴۲

(۱۵) تفصیلی فہرست کے لئے دیکھئے یادگار مجلّہ اہل حدیث ص ۱۵۱۔۱۵۸

(۱۶) نفس مصدر، ص ۱۴۷

xxxxxxxxxxxxxxxxxx

باب چہارم

بریلوی مدارس

نظریاتی پس منظر:

بریلوی مکتب فکر کی ابتدا انیسویں صدی کی نویں دہائی میں اتر پردیش کے علاقہ روہیل کھنڈ کے قصبہ بریلی سے ہوئی (۱) جبکہ مولانا احمد رضا خاںؒ (۱۸۵۶-۱۹۲۱ء) ساکن بریلی نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے دین کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ قصبہ بریلی سے یہ انتساب آگے چل کر ایک مکتبِ فکر اور تحریک کی شکل میں ڈھل گیا۔ لیکن فاضل بریلوی کے عقیدت مندوں نے اپنے کو ہمیشہ ''اہل السنّت والجماعت'' کے نام سے متعارف کرایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کو سنت کا حقیقی نمائندہ وترجمان تصور کرتے ہیں، اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ''الجماعۃ'' سے وابستہ اولین گروہ سمجھتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تحریک شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کے عقائدوافکار، خانوادۂ ولی اللٰہی خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بعض دینی نظریات اور علماءدیوبند کے مکتبِ فکر کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی (۲)۔

بریلوی مکتبِ فکر نے اس عقیدہ کی اشاعت کی کہ رسول اللہ ﷺ حاضر وناظر اور عالم الغیب ہیں بایں طور کہ عالم کا ذرہ ذرہ آپ کی روحانیت ونورانیت کی جلوہ گاہ ہے۔ جس کے لئے قُرب اور بُعد مکان یکساں ہے کیونکہ عالم خلق زمان ومکان کی قید سے مقید ہوتا ہے۔ لیکن عالم امران قیود سے پاک اور آزاد ہے۔ اسی لئے بیک وقت متعدد مقامات پر آپ کا موجود ہونا اور کئی مقامات پر کھلم کھلا بیداری میں اولیاء کا حضور کی زیارت سے مشرف ہونا ممکن اور جائز ہے۔ کیونکہ آپ نُور ہیں اور نور کا اپنی نظر سے تمام دنیا کو دیکھنا اور متعدد مقامات پر موجود ہونا ممکن ہے (۳)۔ آنحضرت ﷺ کو اللہ نے علم غیب عطا فرمایا حتیٰ کہ ''پانچ غیبوں'' میں سے بہت سی جزئیات کا علم بھی دیا (۴)۔ آپؐ سے مدد مانگنا، آپ کو پکارنا اور ''یا رسول اللہ'' کا نعرہ لگانا جائز ہے۔ یہ امداد واستعانت دوسرے اولیاء اللہ کے تئیں بھی درست اور جائز ہے۔ اولیاء کی کرامات اور ان کے تصرفات ان کی وفات کے بعد بھی بدستور ہیں اور ان کے انتقال سے یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا

(۵)۔ اولیاء کی نیاز دینا اور ان کے مزارات پر جا کر ان سے مدد مانگنا جائز ہے۔ اسی طرح فاتحہ خوانی، تیجہ، چالیسواں اور برسی پر ختم دلانا اور ان موقعوں پر اچھے کھانوں کا اہتمام کرنا، قبروں پر اذان دینا، مردے کے کفن پر کلمہ طیبہ لکھنا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی گیارہویں دینا اور اولیاء کے نام پر جانور پالنا سب جائز اور کار ثواب ہے (۶)۔ میلاد کی محفلیں منعقد کرنا، ان میں درود و سلام کا باجماعت اہتمام کرنا اور ذکر رسول کے وقت مؤدّب کھڑے ہو جانا عشق رسول کا تقاضا ہے۔ بیسویں صدی میں اس مکتب فکر کا ایک امتیاز یہ بھی قائم ہو گیا کہ میلاد النبی کے موقع پر ''جلوس محمدی'' کا اہتمام کیا گیا۔ سبز پرچم اور سبز پٹیاں کلمہ طیبہ کی کتابت کے ساتھ باندھی گئیں جلوس میں نعرۂ رسالت یا رسول اللہ، مقبول ہوا۔ مسجدوں میں ہر اذان کے بعد اور بطور خاص نماز فجر کے بعد درود خوانی کا باقاعدہ نظم قائم ہوا۔ آغاز میں اس مکتب فکر کے سب سے زیادہ پیرو دیہاتوں، قصبات اور ناخواندہ طبقوں سے نکل کر آئے تھے۔ مگر اب تعلیم یافتہ حضرات میں بھی اس نے اپنا حلقہ قائم کر لیا ہے اور مدارس، مکاتب، خانقاہوں اور دینی و ثقافتی مراکز کے قیام نے اس کے وسیع اثرات کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

تاریخی طور پر بریلوی مکتب فکر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے رسالہ ''تقویۃ الایمان'' کے ردعمل میں منظم ہوا۔ شاہ صاحب کے بعض معاصرین نے ان کے افکار و نظریات کے جواب میں مختلف کتابچے اور رسالے لکھے ان میں شیخ رشید الدین خاں دہلوی (۱۱۸۳۔۱۲۴۳ھ)، شیخ مخصوص اللہ (م ۱۲۷۱ھ)، شیخ محمد موسی، شیخ محمد شریف دہلوی، مفتی شجاع الدین علی خاں اور علامہ فضل حق خیر آبادی (۱۲۱۲۔۱۲۷۸ھ) کے اسماء گرامی اہم ہیں (۷)۔ تاہم مولانا فضل رسول بدایونی (۱۲۱۳۔۱۲۸۹ھ) کا نام اس سیاق میں سب سے ممتاز ہے، جنھوں نے اپنی تحریروں میں خدا کی ذات و صفات پر کلامی اسلوب میں اظہار خیال کیا اور ''امکان نظر'' کے مختلف فیہ مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

فاضل بریلوی کے افکار:

اس مکتب فکر کی باقاعدہ تشکیل و تنظیم دراصل مولانا احمد رضا خاں (۱۸۵۱۔۱۹۲۱ء) کے ذریعہ ہوئی جنھوں نے اپنے طلبہ، مریدوں اور متبعین کے ساتھ مل کر انیسویں صدی کے اواخر میں اس مکتب فکر کو استحکام عطا کیا۔ فاضل بریلوی کا خانوادہ روہیلہ پٹھانوں پر مشتمل تھا۔ یہ وہ افغان تھے جو مغل دربار میں

ملازمت کی تلاش میں ترک وطن کر کے لاہور، دہلی اور اواخر میں بریلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ دادا رضا علی خان فقہ کے معروف عالم تھے ان کے صاحب زادے مولوی تقی علی خان (م ۱۸۸۰ء) دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف اور عالم دین ہونے کے علاوہ شیعہ و اہل حدیث علماء کے خلاف بھی تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۶ء میں ''تقویۃ الایمان'' کے خلاف معرکہ آرائی کی تھی۔ شاہ آل رسول مارہروی سے ان کی ارادت قائم ہوئی تھی جن کے دادا شاہ برکت اللہ (م ۱۷۲۹ء) نے اٹھارہویں صدی کے سیاسی و مذہبی پس منظر میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح بدایوں اور خیر آباد کے علماء سے بھی اس خانوادے کے گہرے مراسم تھے جو علوم معقولات کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مولانا فضل رسول بدایونی کا حلقہ اثر بھی اس خانوادہ کی ذہنی و فکری تربیت میں بڑا موئثر رہا۔ مولانا فضل رسول خود تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک تھے مگر ان کے طلبہ اور عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد حکومتی ملازمت سے وابستہ تھی۔ مولانا احمد رضا بعد میں ان کے معروف ترین شاگرد بنے۔ اس خانوادہ سے قریبی نسبت رکھنے والوں میں مولانا ارشاد حسین بھی تھے جو سنّی نواب رامپور کلب علی خاں کے دربار میں مذہبی مشیر کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا احمد رضا خاں نے اس نوابی ریاست سے ہمیشہ اچھے مراسم رکھے۔

مولانا احمد رضا خاں نے علوم منقول و معقول میں بکثرت تحریریں نقل کیں۔ ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کل تعداد ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان میں عام طور سے وہی مسائل زیر بحث آئے جو علماء دیوبند و اہل حدیث سے مختلف اور علمائے بریلی کے لئے مابہ الامتیاز ہیں۔ ان تحریروں کا زیادہ زور اختلافی موضوعات پر ہے۔ انداز مناظرانہ و جارحانہ ہے۔ اُن کے مخاطب آریہ سماج و عیسائی نہیں بلکہ مسلمانوں کے مختلف مسالک اور جماعتیں ہیں۔ اِن تحریروں کا ایک تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ مسلمانوں میں کسی تبدیلی اور اصلاح کی روادار نہیں ہیں ان کا موضوع وہ اسلام نہیں ہے جو ماخذ اسلام میں محفوظ اور تاریخ میں نمونہ اور آئیڈیل ہے۔ بلکہ وہ اسلام اِن کی تحریروں کا موضوع ہے جو اپنی موجودہ شکل میں رائج ہے (۸)۔

سب سے زیادہ اختلاف اور نزاع مولانا احمد رضا خاں کی کتاب ''حسام الحرمین'' پر کھڑا ہوا جس کی اشاعت ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ اس فتوی پر ہندوستان کے مولانا نذیر احمد خاں رامپوری جیسے حامی علماء ہی کے دستخط نہ تھے بلکہ علماء حجاز نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ فتوی میں احمدیوں اور تین قسم کے ''وہابیوں'' کو کافر قرار دیا گیا۔ جو ''اسلام کے لبادہ میں کفر کا کام انجام دے رہے تھے'' (۹)۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ہم نواؤں کو ''وہابیت'' اور ''خواتمیہ''

قرار دیا گیا جو رسول اکرم ﷺ کی بے نظیر شخصیت اور خاتم المرسلین کے منصب کے منکر ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے طائفہ کو "وہابیت کذابیۃ" کا خطاب ملا جو اللہ کی طرف کذب کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں۔ تیسری قسم "شیطانی وہابیت" کی ہے۔ جس کے علم بردار علم شیطان کو بسا اوقات علم رسول سے فزوں تر مانتے ہیں۔ اس قسم میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ علماء شامل ہیں (١٠)۔ اس کتاب نے ہندوستان میں فتوی بازی کی راہیں کھول دیں اور جواب آں غزل کے طور پر سینکڑوں فتاویٰ وجود میں آئے اور تکفیر بازی کی اس مہم نے کسی جماعت اور گروہ کو مسلمان نہ رہنے دیا۔

مولانا احمد رضا خاں اور ان کے معتقدین نے برطانوی سیاست میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ وہ مذہبی معتقدات تک محدود رہے البتہ آگے چل کر جب خلافت تحریک کا آغاز ہوا اور گاندھی جی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس نے تحریک آزادی کی مہم چھیڑی تو انھوں نے کافروں اور مشرکوں کے ساتھ موالات کو ناجائز قرار دیتے ہوئے ان دونوں تحریکوں میں کسی قسم کے تعاون سے انکار کردیا (١١)۔ اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف بیانات جاری کئے (١٢)۔

دینی و تعلیمی خدمات:

بریلوی علماء نے انیسویں صدی کے اواخر میں بعض مدارس قائم کئے جو علماء دیوبند کے تصرف میں چلے گئے۔ تاہم بریلی کا مدرسہ منظر اسلام اور پیلی بھیت کی درس گاہ انہی کے انتظام و انصرام میں رہی۔ ١٨٨٧ء میں لاہور میں دارالعلوم نعمانیہ قائم ہوا۔ ١٩٢٠ء میں دارالعلوم حزب الاحناف کی بنیاد پڑی (١٣)۔ اس کے بعد ملک کے طول و عرض میں مدارس اور تعلیم گاہوں کا ایک نظام قائم ہو گیا۔ اس وقت ہندوستان میں بڑے بریلوی مدارس کی تعداد چونتیس ہے، پاکستان میں چودہ اور بنگلہ دیش میں چار۔ ان مدارس میں درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ علوم منقول کے ساتھ علوم معقول منطق و فلسفہ وغیرہ داخل نصاب ہیں۔ بعض مدارس کے طلبہ نے فراغت کے بعد جدید دانش گاہوں کا رخ کیا ہے اور علوم عربیہ و اسلامیہ میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں (١٤)۔ دور جدید کے ہندوستان میں بھی علماء بریلی نے ملی اتحاد سے بالاتر ہو کر اپنا علیحدہ تشخص قائم کر رکھا ہے۔ عائلی مسائل کے حل کے لئے ان کی الگ امارت شرعیہ قائم ہے۔ دہلی میں اپنا علیحدہ مسلم مشاورتی بورڈ بنا رکھا ہے اور اب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید کی تشکیل

کا بھی اعلان کردیا ہے۔اس سے ان کی حرکت اور مسلکی اجتماعیت کا کسی قدر ثبوت فراہم ہوتا ہے (۱۵)۔تاہم اس کی براہ راست زد ملی وحدت پر پڑتی ہے۔

تصنیف و تحقیق اور مناظرہ و دفاع نیز دینی تعلیم و تدریس کے میدانوں میں متعدد بریلوی علماء نے خدمات انجام دی ہیں جن میں چند ممتاز ہیں جیسے مولانا غلام قادر ہاشمی بھیروی (۱۲۶۵۔۱۳۲۷ھ)، شیخ محمد بن فیضی مناظر قادیان (م ۱۳۱۹ھ)، شیخ محمد حسن جان مجددی (۱۲۷۸۔۱۳۶۵ھ)، سید مہر علی جیلانی (۱۲۷۵۔۱۳۵۶ھ)، نذیر احمد خاں رامپوری (م ۱۳۲۳ھ)، محدث وصی احمد پیلی بھیتی (۱۲۵۲۔۱۳۳۴ھ)، شیخ امجد علی اعظمی (۱۲۹۶۔۱۳۶۷ھ)، شیخ محمد شریف سیالکوٹی (۱۲۸۰۔۱۳۷۰ھ)، شیخ عبد العلیم میرٹھی (۱۳۱۰۔۱۳۷۴ھ)، شیخ گلام دستگیر نامی (۱۳۰۰۔۱۳۸۱ھ)، سید محمد سلیمان اشرف بہاری (۱۲۹۵۔۱۳۵۸ھ)، شیخ نبی بخش حلوائی (۱۲۷۶۔۱۳۶۳ھ)، صدر الافاضل نعیم الدین مرداآبادی (۱۳۰۰۔۱۳۶۷ھ)، شیخ نور بخش توکلی (۱۳۰۵۔۱۳۶۷ھ)، شیخ احمد سعید کاظمی (۱۳۳۲۔۱۴۰۶)، مفتی اعجاز ولی بریلوی (۱۳۳۲۔۱۳۹۳ء)، مفتی حشمت علی خاں لکھنوی (۱۳۲۰۔۱۳۸۰ھ)، ابوالفضل سردار لائل پوری (۱۳۲۲۔۱۳۸۲ھ)، شیخ عبدالحفیظ مفتی آگرہ (۱۳۱۸۔۱۳۷۷ھ)، حافظ ملت شیخ عبدالعزیز مرادآبادی (۱۳۱۲۔۱۳۹۶ھ)، مفتی محمد اجمل سنبھلی (۱۳۲۲۔۱۳۸۳ھ) وغیرہ (۱۶)۔

جامعہ اشرفیہ:

اس مکتب فکر کی نمائندہ سب سے بڑی درسگاہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ ہے جس کی تاسیس ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں چند دردمند مسلمانوں کے ذریعہ عمل میں آئی۔ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۲ء میں حافظ ملت شیخ عبدالعزیز محدث مرادآبادی (۱۳۱۲۔۱۳۹۶ھ) نے اس ادارہ میں قدم رکھا اور اس کی تعمیر و توسیع میں لگ گئے۔وہاں صدر مدرسین اور شیخ الحدیث کے مناصب پر فائز ہوئے تو ادارہ کا اثر و نفوذ ملک کے طول و عرض میں محسوس ہونے لگا اور اس کے تعلیمی معیار، نظم و ضبط اور مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔قصبہ کی گنجان آبادی سے باہر وسیع و عریض عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی۔۱۹۷۲ء میں ۲۸/۱ ایکٹر کا قطعہ اس مقصد کے لئے خرید اگیا جو بعد میں بڑھ کر ۲۷/۳ ایکٹر سے زائد طویل کیمپس میں تبدیل ہوا۔سرکاری کاغذات و دستاویزات میں پہلے اس ادارہ کا نام دارالعلوم اشرفیہ درج کیا گیا اب الجامعۃ الاشرفیہ کے نام سے پورے ملک میں اپنے مسلک کی علمی و فکری ترجمانی کر رہا ہے (۱۷)۔

جامعہ اشرفیہ کے مراحل تعلیم بیس سالوں کی تدریس میں منقسم ہیں۔ ابتدائی تعلیم چھ سالوں پر محیط ہے۔ ثانوی مرحلہ میں پانچ سال صرف ہوتے ہیں۔ درجات عالمیت چار سال اور درجات فضیلت دو سالوں پر مشتمل ہے اور علوم اسلامیہ، عربی زبان وادب، فقہ حنفی اور علوم عقلیہ کے چار اختصاصی نصابوں کی علیحدہ علیحدہ تدریس میں دو سال کی مدت درکار ہوتی ہے۔ نصاب و نظام تعلیم درس نظامی ہی کے طرز پر اختیار کیا گیا ہے البتہ اس میں انگریزی مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۲ء کے اعداد و شمار کی روشنی میں اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد چار ہزار آٹھ سو پینتالیس قرار پاتی ہے (۱۸)۔

غیر تدریسی سرگرمیوں میں فتویٰ نویسی کافی اہم ہے اس کے لئے مفتی محمد شریف الحق امجدی کی نگرانی میں ایک شعبہ الگ سے کام کر رہا ہے۔ ہر ماہ تقریباً پانچ سو فتاویٰ جاری کیے جاتے ہیں۔ نشر و اشاعت کا شعبہ ۱۹۵۷ء سے متحرک ہے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی کے فتاویٰ کی متعدد جلدیں یہ شعبہ شائع کر چکا ہے۔ ماہنامہ اشرفیہ ۱۹۷۶ء سے اردو میں دینی و علمی موضوعات پر مسلسل مضامین شائع کر رہا ہے جو ملک کے طول و عرض میں پڑھے جاتے ہیں۔ نوجوان عالم مولانا مبارک حسین مصباحی اس کے فاضل مدیر ہیں ان کے قلم میں روانی اور توانائی ہے۔

تعلیم و تدریس کے میدان میں جامعہ اشرفیہ کے ممتاز فضلاء مولانا مظفر حسین ظفر ادیبی، مولانا شمس الحق مصباحی، قاضی شفیع احمد، سید حامد اشرف کچھوچھوی، بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی، علامہ ضیاء المصطفی قادری، علامہ محمد احمد مصباحی، علامہ عبد الشکور مصباحی، مولانا نصیر الدین مصباحی، مولانا عبد المبین نعمانی، مولانا اسرار احمد مصباحی وغیرہ۔ تصنیف و تحقیق کے میدان میں شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی، علامہ ارشد القادری، یٰسین اختر مصباحی، بدر القادری مصباحی، افتخار احمد قادری وغیرہ کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔ جبکہ دعوت و تبلیغ کے شعبہ میں جن فضلاء اشرفیہ نے شہرت حاصل کی ان میں علامہ قمر الزماں اعظمی، علامہ شفیق احمد اعظمی، علامہ بدر القادری اور علامہ ضیاء المصطفی قادری کی خدمات سے ہر شخص واقف ہے۔ نئے فضلاء میں ایک ممتاز نام ڈاکٹر غلام یحیی انجم کا ہے جو متعدد کتابوں کے مصنف اور جامعہ ہمدرد کے شعبہ اسلامیات میں سینئر استاذ ہیں (۱۹)۔

xxxxxxxxxxxxxxxxxxxx

تعلیقات وحواشی:

(۱) قصبہ بریلی صوبہ اترپردیش کا ضلعی صدر مقام ہے۔ اس کی بنیاد ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء میں رکھی گئی۔ یہ روایت ہے کہ اس قصبہ کا نام ایک شخص ''باسدیو'' کے نام پر رکھا گیا جو ذات کا روہیلہ راجپوت تھا۔ نوابی علاقوں میں بانسوں کے جنگل کی وجہ سے اسے بانس بریلی بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے سید احمد شہید کے موطن رائے بریلی سے امتیاز بھی ہوگیا۔ روہیل کھنڈ کے راجپوت قبیلوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لئے اکبر کے دور میں یہاں ایک قلعہ تعمیر ہوا اور اس کی نواحی آبادی ترقی کر کے ۱۵۹۶ء تک ایک پرگنہ کے صدر مقام میں تبدیل ہوگئی۔ جسے شاہجہاں نے کھٹیر (روہیل کھنڈ کا پرانا نام) کا دارالحکومت بنا دیا۔ ۱۶۵۷ء میں نئے صوبے دار مکرند رائے نے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ ۱۷۰۷ء میں بریلی کے ہندؤں نے مغل صوبے دار کو نکال باہر کیا اور خود حکومت سنبھال لی۔ بعد میں روہیلہ سردار علی محمد خان صوبہ دار ہوا جس کی وفات ۱۷۴۹ء میں ہوئی اور حافظ رحمت خان اس کا جانشین ہوا جو تھوڑی ہی مدت میں روہیل کھنڈ کا مسلمہ حکمراں بن گیا۔ ۱۸۰۱ء میں اس علاقہ پر انگریز قابض ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حافظ رحمت خان کے پوتے بہادر خان کی صوبہ داری کا اعلان کر دیا گیا تو شہر میں قتل وخون کا بازار گرم کر دیا گیا۔ مجاہدین آزادی کی ناکامی کے بعد سقوط دہلی کا سانحہ رونما ہوا تو ۱۸۵۸ء میں اس شہر پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۳۷، ۱۸۴۲ء اور ۱۸۷۱ء میں یہاں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور پھر متعدد بار فرقہ وارانہ تصادم کے نتیجہ میں اس شہر کا جانی و مالی نقصان ہوا۔ بریلی بریگیڈ کا جنرل بخت خان جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دہلی کی مجاہد فوجوں کا سپہ سالار مقرر ہوا تھا اسی شہر کا باشندہ تھا۔ یہاں کی قابل ذکر عمارت رحمت خان کا مقبرہ ہے جسے ان کے بیٹے ذوالفقار خان نے ۱۷۷۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اب اس شہر کی شہرت مولانا احمد رضا خان اور ان کے مریدین کی خدمات کی وجہ سے ہے۔ دیکھئے اردو دائرۃ المعارف ج ۴، ص ۴۸۷۔۴۸۸

(۲) مظفر الدین، حیات اعلیٰ حضرت، کراچی، ۱۹۵۵ء ص ۲۰۔۳۶

(۳) احمد سعید کاظمی، تسکین الخواطر، ملتان، ص ۸۲

(۴) مفتی احمد یار خان، جاء الحق وزھق الباطل، لاہور، ص ۳۹، ۱۴۷، ۱۶۶

(۵) احمد رضا خان، حیات الموات، لاہور، ص ۱۱۳

(۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے، مفتی احمد یار خان، حوالہ بالا

(۷) مولانا محمد احمد مصباحی نے ان مخالفین میں سے بعض کی مختصر سوانح رقم کی ہے۔ دیکھئے: حدوث الفتن و جهاد أعيان السنن، مطبوعه مع المعتقد المنتقد للعلامة فضل الرسول القادری مع شرحه المسمیٰ المستند المعتمد بناء نجاة الأبد للعلامة احمد رضا القادری البریلوی، رضا اکیڈمی، ممبئی ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء ص ۲۰۲،۴۰۲۔۴۰۳

(۸) مٹکاف (حوالہ بالا، ص ۲۹۶) نے اس مکتب فکر پر یوں تبصرہ کیا ہے:

They wanted to preserve Islam unchanged : not Islam as,it was idealized in texts or the historical past, but Islam as it had evolved to the present.

(۹) مولانا احمد رضا خان بریلوی، حسام الحرمین، لاہور ۱۹۷۵ء ص ۱۵

(۱۰) دیکھئے حوالہ بالا، ص ۲۱۔۲۵

(۱۱) مثال کے طور پر تحریک خلافت کے ایک قائد مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو جو خطوط فاضل بریلوی نے لکھے ان میں اپنے اس موقف کا انھوں نے برملا اظہار کیا۔ دیکھئے مولانا ظفر الدین رضوی، حیات اعلیٰ حضرت، کراچی، ۱۹۳۸ء، ص ۲۹۰، ۲۹۸، ۲۹۹۔۳۰۲، ۳۰۵

(۱۲) چنانچہ مولانا حشمت علی لکھنوی نے ۱۳۶۴ھ کے ایک فتویٰ میں اس طرح کی تمام سیاسی سرگرمیوں کو خلاف شرع قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں "ہر سنی مسلمان پر شریعت مطہرہ کی روشنی میں روشن ہے کہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد صریح محرمات شرعیہ پر مشتمل اور حرام قطعی اور باعث وبال ونکال وکفر وضلال ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ کی شرکت ورکنیت اور امداد و اعانت بحکم شریعت مطہرہ اسی طرح گناہ، ممنوع وحرام وناجائز ہے جس طرح ندوہ وکانگریس کی شرکت ورکنیت و امداد و اعانت شرعاً گناہ وحرام ہے۔" فتاویٰ اهل السنة، ترتیب غلام حسین قادری، کان پور، ص ۲

(۱۳) حافظ نذر احمد، جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۲ء ص ۲۷۔۲۹

(۱۴) ہندوستان میں بریلوی مدارس کی ایک فہرست درج ذیل ہے:

اتر پردیش:

(۱) جامعہ اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ (۲) جامعہ منظر اسلام بریلی

(۳) جامعہ مظہر اسلام، بریلی (۴) جامعہ نوریہ رضویہ، بریلی

(۵) جامعہ نعیمیہ، مرادآباد (۶) دارالعلوم شمس العلوم، گھوسی، مئو

(۷) جامعہ امجدیہ رضویہ، گھوسی، مئو (۸) جامعہ حمیدیہ، وارانسی، مدن پورہ

(۹) جامعہ غوثیہ حنفیہ، وارانسی، بجرڈیہ (۱۰) جامعہ فاروقیہ، وارانسی، مدن پورہ

(۱۱) دارالعلوم فیض الرسول، براؤں، سدھارتھ نگر (۱۲) دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی

(۱۳) جامعہ اسلامیہ، روناہی، فیض آباد (۱۴) دارالعلوم تنویرالاسلام، امرڈوبھا، بستی

(۱۵) دارالعلوم تدریس الاسلام، بسڈیلہ، بستی (۱۶) جامعہ قادریہ، رچھا، بریلی

(۱۷) دارالعلوم وارثیہ، لکھنؤ (۱۸) دارالعلوم غریب نواز، الہ آباد

(۱۹) جامعہ حبیبیہ، الہ آباد (۲۰) مدرسہ اجمل العلوم، سنبھل

(۲۱) جامعہ غوثیہ رضویہ، سہارن پور

دہلی:

(۲۲) جامعہ حضرت نظام الدین، نئی دہلی، ذاکر نگر

راجستھان:

(۲۳) دارالعلوم اسحاقیہ، جودھپور

گجرات:

(۲۴) دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد (۲۵) دارالعلوم فیض اکبری، لونی کچھ

(۲۶) دارالعلوم نور محمدی، دیادرہ، بھڑوچ

مہاراشٹر:

(۲۷) دارالعلوم امجدیہ ناگ پور (۲۸) دارالعلوم محمدیہ، ممبئی۔۳

(۲۹) درالعلوم محبوب سبحانی، کرلا ممبئی (۳۰) دارالعلوم امام احمد رضا، کونڈلے و رلے، رتناگیری

بہار:

(۳۱) جامعہ فیض العلوم، جمشید پور (۳۲) دارالعلوم علیمیہ، مظفر پور

کیرلا:

(۳۳) مرکز الثقافۃ السنیۃ، کارندور کالی کٹ (۳۴) جامعہ سعدیہ، کاسرگوڈ

پاکستان میں اہم بریلوی مدارس کی فہرست یہ ہے:

(۱) جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور (۲) جامعہ نعیمیہ، لاہور

(۳) جامعہ انوار العلوم، ملتان (۴) جامعہ ضیاء العلوم، راولپنڈی

(۵) جامعہ امینیہ رضویہ محمد پورہ، فیصل آباد (۶) جامعہ جھنگ بازار، فیصل آباد

(۷) جامعہ قادر آباد، مصطفیٰ آباد، سرگودھا روڈ (۸) دارالعلوم امجدیہ، کراچی، عالمگیر روڈ

(۹) جامعہ انوار مجددیہ نعیمیہ، کراچی، غریب آباد (۱۰) جامعہ انوار القرآن، کراچی، گلشن اقبال

(۱۱) جامعہ تعلیم الاسلام، کراچی، بولٹن مارکیٹ (۱۲) دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ، کراچی، صاحب داد

(۱۳) جامعہ راشدیہ، پیرجو گوٹھ، خیر پور (۱۴) جامعہ قادریہ، بغدادہ، مردان

بنگلہ دیش کے بریلوی مدارس میں چار اہم ہیں:

(۱) جامعہ احمدیہ سنیۃ، چاٹگام (۲) جامعہ قادریہ طیبیہ، ڈھاکہ

(۳) جامعہ قادریہ، ہاٹ ہزاری (۴) جامعہ امام عبداللہ، دیناج پور

محمد احمد مصباحی، حدوث الفتن وجہاد اعیان السنن، حوالہ بالا، ص ۴۳۷۔۴۳۹۔ ان معلومات کے لئے میں مولانا ارشاد احمد رضوی (ساحل سہرامی) کا مشکور ہوں۔

(۱۵) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید کے جنرل سیکریٹری مولانا توقیر رضا خاں قادری کا التماس بہر حال یہ ہے کہ اس نئے بورڈ پر "انتشار بین المسلمین" کا لیبل چسپاں نہ کیا جائے اور اسے "مسلکی چشمہ تعصب" سے نہ دیکھا جائے کہ "یہ سراسر ہٹ دھرمی اور ذہنی دیوالیہ پن" کا ثبوت ہے۔ مولانا قادری کا الزام ہے کہ (۱) مسلم پرسنل لا بورڈ کی گذشتہ تیس بتیس سالہ دور کارکردگی میں جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف مایوس کن ثابت ہوئے ہیں بلکہ بورڈ اور اس کے ذمہ داران اپنی نااہلیوں کے ساتھ ہی دین وشریعت میں تحریف، تنقید اور تبدیلی کے خواہاں اور جرم کے مرتکب بن کر بھی سامنے آئے ہیں۔" وہ شاکی ہیں کہ شیعہ رہنما مولانا کلب صادق کے بیانات کے خلاف بورڈ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ وہ اہل تشیع کے سوا بورڈ جدید کے دروازے "ائمہ اربعہ کے کسی بھی مقلد اور ماننے والے کے لئے بند" نہیں کرنا چاہتے بشرطیکہ "وہ اللہ کی الوہیت اور رسول مقبول کی رسالت وعظمت سے وفاداری اور دین وشریعت کی پاسداری کا ثبوت فراہم کرے" (روزنامہ راشٹریہ سہارا ۶ ر فروری ۲۰۰۵ء میں مطبوعہ مضمون "نئی کوشش کو مسلکی چشمہ سے دیکھنا غلط" ص، ۵ سے ماخوذ) ایک دوسرے بریلوی عالم مولانا یٰسین اختر مصباحی اس بورڈ جدید کے قیام سے متفق نہیں ہیں۔ یہ امید بھی انھیں نظر نہیں آرہی ہے کہ "یہ اپنے طبقہ کی بڑے پیمانہ پر تائید وحمایت حاصل کر پائے گا" اُن کی رائے میں اس نئے بورڈ سے چھیڑ چھاڑ بے سود اور اضاعت وقت ہے (نفس مصدر، مضمون "دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید")۔

(۱۶) محمد احمد مصباحی، حوالہ بالا، ص ۱۱۱-۱۴۴۔ مصنف نے علمائے بریلی کو پانچ طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کی مختصر سوانح بھی فراہم کی ہے۔

(۱۷) دلیل دار العلوم الأشرفيه بمبار كفور، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء ص ۲-۳

(۱۸) نفس مصدر، ص ۱۰

(۱۹) ڈاکٹر غلام یحیی انجم کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مسلکی مسائل و شخصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور عمومی موضوعات ومباحث سے بھی گہری دلچسپی دکھائی گئی ہے۔ ثانی الذکر موضوعات کی نمائندہ کتابوں میں "مصری مورخین۔ ایک مطالعہ"، متنبی۔ ایک تحقیقی مطالعہ، معلم العربیہ وغیرہ اہم ہیں۔

xxxxxxxxxxxxxxxxxx

باب پنجم

دارالعلوم ندوۃ العلماء

تشکیل ندوۃ العلماء:

تحریک ندوۃ العلماء کی تاسیس وتنظیم دین متین کی خدمات، دفاع اسلام کے لئے مشترکہ منصوبہ بندی اور نزاع بین العلماء کو رفع کرکے انھیں ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کے مسعود خوابوں کی تعبیر کے طور پر ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علماء کی مجلس مشاورت کی متفقہ تجویز کے نتیجہ میں ۲۳۔۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو اسی مقام پر ہوئی۔ اتحاد ملی کا یہ ایک حسین نظارہ تھا جو چشم فلک نے انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں دیکھا۔ ''اس میں ہر فرقہ کے صنادید شریک جلسہ تھے۔ علماء حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے'' (۱)۔ دینی نصاب تعلیم کی اصلاح اور تشکیل نو کے لئے اسی اجلاس مین ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں مولانا محمد علی مونگیری، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا محمد حسین الٰہ آبادی، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا ظہور الاسلام فتح پوری شامل تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی مشورہ طلب کرنے کی سفارش کی گئی۔ اول الذکر ندوۃ العلماء کے اولین ناظم مقرر ہوئے۔ مولانا الطاف حسین حالی گو شرکت نہ کرسکے مگر ان کی تجاویز جلسہ میں پڑھ کر سنائی گئیں (۲)۔

تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی طور پر دو مقاصد قرار پائے:

(۱) سلسلہ تعلیم کو درست کرنا اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں اسے جاری کرنا اور طلبہ کی تہذیب واخلاق اور ترقی علم میں جو امور مفید ہوں، حتی الوسع ان کے اجرا میں سعی کرنا۔

(۲) اس امر کی کوشش کرنا کہ علماء میں باہمی نزاع نہ ہونے پائے اور اگر کوئی اختلاف واقع ہو جائے تو اسے رفع کرنا (۳)۔

ندوۃ العلماء کے مختلف اجلاسوں میں انگریزی اور جدید علوم کو شامل نصاب کرنے پر

زور دیا گیا۔ مولانا حالی کی تجویز کا مقصد مغرب کی تہذیب اور اس کے مذہب کی تردید و ابطال کرنے والے طلبہ تیار کرنا تھا (۴)۔ مولانا محمد علی مونگیری نے فلسفۂ جدید کو رد کرنے کے لئے زبان انگریزی کا جاننا ضروری قرار دیا کیونکہ تراجم کی مدد سے یہ کام نہیں ہوسکتا (۵)۔ اور فارسی و ترکی زبانیں اولاً کفار کی زبانیں تھیں اسی طرح انگریزی زبان والے اسلام لائیں تو ان کا حال بھی فارسی ترکی زبان کا سا ہو جائے گا۔ اس لئے دنیاوی ضروریات سے آگے بڑھ کر خود اپنی ضرورت و مصلحت کا تقاضا ہے کہ انگریزی زبان سیکھی جائے (۶)۔ مولانا شبلی نعمانی جو علوم عصریہ کو داخل نصاب کرنے کے پرزور وکیل تھے اور اپنے مشن کو ناکام ہوتا دیکھ کر بعد میں ندوۃ العلماء سے دل برداشتہ ہو گئے، مغرب سے بہتر تعامل اور مغربی افکار و نظریات کی صحیح تفہیم کے لئے علوم جدیدہ کی تدریس پر زور دیتے تھے (۷)۔

تحریک ندوۃ العلماء کا اتحادِ ملی کا خواب اگلے چند برسوں میں خواب پریشاں بن کر رہ گیا۔ ۱۳۱۳ھ کے جلسہ میں اہل تشیع پر پابندی لگادی گئی کہ وہ جلسہ میں کوئی تقریر کرسکتے ہیں نہ تجویز پیش کرسکتے ہیں کیونکہ پہلے اجلاس میں شیعہ مجتہد کی تقریر سے بدمزگی ہوگئی تھی (۸)۔ علماء دیوبند بھی رفتہ رفتہ کنارہ کش ہو گئے۔ علمائے بریلی نے تو مخالفت کی مہم شروع کردی۔ مولانا احمد رضا خان، مولانا عبد القادر بدایونی اور مولانا نذیر احمد خان رامپوری نے اس تحریک سے روبرو تصادم کی راہ اختیار کی اور کتابوں، اشتہارات، تقریروں، منظومات اور فتاویٰ کے ذریعہ مخالفتوں کا طوفان کھڑا کردیا (۹)۔ مخالفت کنارہ کشی، اعتراض واحتراز کے اس شدید دباؤ کے باوجود تحریک ندوہ کی شاخیں ۱۳۱۶ھ میں مختلف شہروں میں قائم ہوگئیں۔ پانی پت شاخ کے صدر مولانا حالی مقرر ہوئے۔ اسلام پور پٹنہ شاخ کی رکنیت وہاں کے اکثر علماء و مشائخ اور روساء نے اختیار کی۔ شاہجہاں پور گجرانوالہ اور جالندھر میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔

دار العلوم کا قیام:

نصاب تعلیم کی ضروری اصلاح اور عصری ضروریات دین کی تکمیل کے لئے مخلص خادمان دین کی تعلیم و تربیت اور تیاری کی غرض سے آخر کار دار العلوم ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور ۹ر جمادی الاولی ۱۳۱۶ھ/ ۲۶ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو لکھنؤ میں درجہ ابتدائی کھول دیا گیا جو بتدریج ترقی کر کے ایک اسلامی جامعہ میں تبدیل ہو گیا۔ دار العلوم کے لئے مولانا محمد علی مونگیری نے جو

نصاب تعلیم تجویز کیا تھا اس میں بیس علوم کا ذکر ہے۔ بیشتر علوم متداولہ ہیں۔ ۶ علوم کا مولانا نے اضافہ کیا ہے۔ تاریخ، اصول لغت، تجوید، عروض، سلوک وتہذیب نفس اور اسرار احکام (۱۰)۔ اس مجوزہ نصاب میں جدید فلسفہ، جدید ہیئت، جدید تاریخ کی ضرورت کا اعتراف کرنے کے باوجود ان مضامین کی کتابیں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح ریاضی اور جغرافیہ کے مضامین پر کسی کتاب کی سفارش نہیں کی گئی اور سیاسیات واقتصادیات جیسے مضامین کا باضابطہ طور پر ذکر ہی نہیں ہے (۱۱)۔ یہ دارالعلوم کے لئے اولین نصاب تعلیم کا خاکہ تھا جس میں بعد میں متعدد ترامیم اور اضافے کیے گئے۔ اب جو نصاب ندوۃ العلماء میں رائج ہے وہ متعدد اضافوں اور ترمیمات کے بعد کافی عصری اور مناسب حال ہو گیا ہے۔ صرف ونحو، ادب وانشاء اور جغرافیہ وغیرہ مضامین پر فضلاء ندوہ کی تیار کردہ کتب داخل نصاب کر لی گئی ہیں۔ لیکن روح، مزاج اور فطرت کے اعتبار سے نصاب وہی ہے جو مولانا محمد علی مونگیری نے تجویز کیا تھا۔

مولانا محمد علی مونگیری کی صراحت کے مطابق قیام دارالعلوم کے چار مقاصد تھے:

(۱) علوم وفنون کی تکمیل

(۲) علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں کمال پیدا کرنا تاکہ الحاد ودہریت کا مقابلہ کیا جا سکے، علم فقہ میں تبحر پیدا کرنا تاکہ عبادات ومعاملات میں علماء کے فتاویٰ مستند اور واجب العمل ہوں۔

(۳) مسلمانوں میں اسلامی اخلاق اور شائستگی پیدا کرنا اور ان کو عمدہ اطوار اور عادتوں کا خوگر بنانا۔

(۴) طلبہ میں عالی ظرفی وفراخ حوصلگی پیدا کرنا اور انھیں پست حوصلگی اور بے توقیری سے بچانا (۱۲)۔

مولانا محمد علی مونگیری کے دور نظامت (۱۸۹۸ء۔۱۹۰۳ء) کے بعد مختلف علماء اور دینی وسماجی شخصیات نے اس بار گراں کو اٹھایا اور اپنے اپنے دور میں دارالعلوم کی ترویج وترقی کے لئے انتھک جدوجہد کی۔ مولانا مسیح الزماں خان (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۰۵ء)، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری (۱۹۱۳ء۱۹۱۵ء)، حکیم سید عبدالحئی حسنی (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۲۳ء)، صفی الدولہ حسام الملک نواب علی حسن خان (۱۹۲۳ء۔۱۹۳۰ء)، ڈاکٹر سید عبدالعلی (۱۹۳۱ء۔ ۱۹۶۱ء) اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۶۱ء۔۱۹۹۹ء) نے اپنے اپنے دور نظامت میں ندوۃ العلماء کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھایا۔

روشن خیالی اور وسیع النظری:

ہندوستان کی اسلامی فکر میں فقہی و مکتبی نقطۂ نظر کی جگہ ملی سوچ، روشن خیالی و وسیع النظری، آزادیٔ فکر اور عصری حسیت کی شمولیت میں مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) اور سید سلیمان ندوی (۱۸۸۱ء-۱۹۵۳ء) کی تحریروں کا بڑا دخل ہے۔ علامہ شبلی نے الفاروق، الغزالی، المامون اور سیرت النعمان جیسی کتابیں تصنیف کر کے اعلیٰ دینی ادب ہی کی تخلیق نہیں کی بلکہ تاریخ اسلام سے عقیدت و شیفتگی بھی پیدا کی اور سیرت النبیؐ کی تکمیل نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی جس میں معذرت خواہی اور دفاع کی جگہ اقدام و عمل اور تعمیر و اصلاح کے عوامل کی زیادہ کارفرمائی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تاسیس کی جس کا بلند پایہ علمی رسالہ ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۱۶ء سے شائع ہونے لگا۔ ۲۶۔ ۲۸/ فروری ۱۹۸۲ء میں ''اسلام اور مستشرقین'' کے موضوع پر اس ادارہ نے بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کیا جس میں دنیائے اسلام کے نامور محققین و مصنفین شریک ہوئے۔ یہاں سے اسلامی ثقافت کے احیاء، مستشرقین کے اعتراضات کی علمی و عقلی تردید اور ان کے جواب و دفاع کی خاطر زبان و ادب، تحقیق و تاریخ نگاری کے عصری تقاضوں کی رعایت کے ساتھ اب تک تقریباً سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان تمام وقیع کاوشوں میں اسلام کی موثر تشریح اور مثبت اور تعمیری رجحان کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی علمی و تحقیقی نگارشات ''ارض القرآن''، ''خیام''، ''عرب و ہند کے تعلقات''، ''عربوں کی جہاز رانی''، ''نقوش سلیمانی'' اور سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبیؐ کی آخری پانچ جلدیں اسلامی ادبیات کی یادگار اور سدا بہار کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں جو ''اپنے مواد و اسلوب، علمی و فکری اہمیت و افادیت، احقاقِ حق و ابطالِ باطل، اسلام کی صحیح ترجمانی اور دلنشیں تعارف میں اپنی نظیر آپ ہیں۔'' (۱۳)

حکیم سید عبدالحئی حسنی کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا دیوبند سہارن پور کے دینی و روحانی حلقوں سے رابطہ قائم ہوا اور رفتہ رفتہ قربت اتنی بڑھی کہ جماعت تبلیغ کا دوسرا مرکز ندوہ قرار پایا۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے دو رفقاء کے ساتھ دہلی میں مولانا محمد الیاسؒ (۱۸۸۵-۱۹۴۴ء) سے ملاقات کی۔ اور ''ان پر انجذاب کی غیر معمولی کیفیت طاری ہوئی'' (۱۴)۔ ۱۸/ جولائی ۱۹۴۳ء کو بانی تبلیغی جماعت علماء و اعیان کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے۔ اگلے دن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوری بھی

آ گئے ۔ ان بزرگوں کی آمد اور ندوہ میں قیام نے اس دار العلوم میں دینی فضا اور نمایاں دینی رجحان کو تقویت دی اور دعوتی و تبلیغی جدوجہد میں ادارہ کی بھرپور شرکت کا ماحول بنا دیا اور ''ندوۃ العلماء سے جماعت تبلیغ کا خصوصی تعلق قائم ہو گیا'' (۱۵)۔

اسلامی درسیات کی تیاری:

اسی دور نظامت میں عربی زبان وادب کے نصاب اور طرز تعلیم میں مناسب تغیر اور اصلاح کا عمل انجام پایا۔ ندوہ نے اسلامی درسیات پر مشتمل ایک سہل اور موثر نصاب تیار کیا جس کی افادیت ملک و بیرون ملک ہر جگہ محسوس کی گئی۔ اس نے نصاب کو خود کفیل بنایا اور عربی زبان پڑھانے کا راست منہج اختیار کیا جو بہت کامیاب رہا۔ مختارات من الأدب العربی، القراءۃ الراشدۃ، قصص النبیین للأطفال، مطالعہ قرآن کے بنیادی اصول، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تیار کردہ درسیات ہیں، مولانا سید محمد رابع ندوی نے منشورات اور ''الأدب العربی بین عرض ونقد'' اور ''جزیرۃ العرب'' تالیف کیں۔ مولانا عبد الماجد ندوی نے معلم الانشاء دو حصوں میں ترتیب دی۔ مولانا محمد اویس ندوی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب ''العقیدۃ الحسنۃ'' کو اپنے مفید تشریحی حواشی کے ساتھ ''العقیدۃ السنیۃ'' کے نام سے مرتب کیا۔ مولانا شفیق الرحمٰن ندوی نے موضوع عبادات پر'' الفقہ المیسر '' مرتب کی جس میں نوعمروں کی نفسیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مولانا محبوب الرحمٰن ازہری نے المحاورۃ العربیۃ کے نام سے ابتدائی درجات کے لئے ریڈر تیار کر دی ہے اور پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے ادارہ کے لئے بی اے کے نصاب کے مطابق اسلامیات پر'' تاریخ تہذیب اسلامی'' کے نام سے چار حصوں میں کتاب لکھی ہے۔ جس کی ابتدائی دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ اسلامی درسیات کی تیاری کا یہ بڑا وقیع کام ہے جو ندوۃ العلماء اور اس کے فضلاء نے انجام دیا ہے (۱۶)۔

صحافتی خدمات:

دار العلوم ندوۃ العلماء نے اردو و عربی صحافت کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی ادارت میں پہلی بار اردو ماہنامہ ''الندوۃ'' اگست ۱۹۰۴ء / جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ میں منظر عام پر آیا۔ جون ۱۹۱۲ء میں اس

کے مدیر وہیں کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم ہوئے۔ چند ماہ کے بعد مولانا اکرام اللہ خان ندوی نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ مدتوں کے بعد جنوری ۱۹۴۰ء سے سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی و مولانا عبدالسلام قدوائی کی ادارت میں دوبارہ اس کا اجراعمل میں آیا اور جولائی ۱۹۴۲ء تک نکلتا رہا۔ یہ اپنے گراں قدر علمی و دینی مقالات اور تعلیمی و اصلاحی خیالات کے سبب اپنے وقت کا منفرد و ممتاز رسالہ تھا جس کو مشاہیر اہل علم وقلم کا تعاون حاصل تھا (۱۷)۔

عالم عرب میں اسلامی فکرو دعوت کی وسیع پیمانے پر اشاعت اور ہندوستان اور عالم اسلام کے درمیان علمی و ثقافتی روابط کو مضبوط بنانے کی غرض سے مئی ۱۹۳۲ء/محرم ۱۳۵۱ھ میں مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں عربی ماہنامہ ''الضیاء'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ تقریباً چار سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں اس کی اشاعت بند ہوگئی مگر ہندوستان کی عربی صحافت کی تاریخ میں اپنی جگہ مخصوص کر گیا۔ (۱۸)۔ اسی کے ذریعہ فاضل مدیر کے علاوہ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی علمی و ادبی صلاحتیں ملک کے سامنے آئیں۔ ۱۳۷۵ھ/اکتوبر ۱۹۵۵ء میں عربی کا ایک اور ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' مولانا محمد حسنی کی ملکیت و ادارت میں نکلا جس نے عرب قومیت، الحاد و دہریت اور تجدد و مغربیت کا تعاقب و محاسبہ کیا اور صحیح اسلامی فکر کی نمائندگی کی (۱۹)۔ ۱۹۵۹ء میں مجلس انتظامی ندوۃ العلماء نے اس رسالہ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب یہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کی ادارت میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ نے اپنی پچاس سالہ تاریخ میں علم وفن اور تحقیق و ادب کے بڑے معرکے سر کئے۔ اب یہ عالم اسلام کے موقر رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۵۹ء ہی میں مولانا سید محمد رابع ندوی کی ادارت میں ایک عربی پندرہ روزہ ''الرائد'' کے نام سے جاری ہوا جو آج کل مولانا سید واضح رشید ندوی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

فضلائے ندوہ نے اپنی مادر علمی سے باہر بھی قدم جمائے اور عربی، انگریزی اور اردو صحافت میں ممتاز مقام حاصل کیا اور صحیح اسلامی فکر کی نمائندگی کی۔ ان میں پروفیسر عبدالحلیم ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، پروفیسر محمد اجتبا ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا عبدالنور عبدالعظیم ندوی، پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، پروفیسر سید سلیمان ندوی، پروفیسر محمد راشد ندوی، پروفیسر

محسن عثمانی، پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی وغیرہ کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا عروج اسی وقت شروع ہوا جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ ان کے دور نظامت میں یہ ادارہ ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر عالم عرب میں بھی متعارف ہوا جس کا سب سے بڑا ذریعہ ممالک عربیہ واسلامیہ کے مسلسل دوروں اور وہاں کی جامعات، علمی مجالس اور دینی اجتماعات میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تقریریں اور خطابات ہیں جن کا آغاز ۱۹۵۰ء میں سفر حجاز، شام اور مصر و سوڈان سے ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اسفار کا یہ سلسلہ جاری رہا اور نہ صرف ممالک عربیہ بلکہ یوروپ کے متعدد ملکوں تک اس کا سلسلہ دراز ہو گیا اور رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ وغیرہ کے سالانہ جلسوں میں شرکت اور مولانا کی عربی تصانیف کی عالم عرب میں بڑے پیمانے پر اشاعت و مقبولیت کی وجہ سے ندوہ کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ (۲۰)۔ پھر ۳۱/اکتوبر۔ ۳/نومبر ۱۹۷۵ء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی نے گویا سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اس مہرجان تعلیمی میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وزیر اوقاف و امور اسلامی کویت ڈاکٹر محمد حسین الذہبی، رئیس القضاۃ ابوظہبی شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک، محدث شام شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور عرب ممالک کے دوسرے وفود شریک ہوئے۔ ہندوستان سے مولانا منت اللہ رحمانی، ڈاکٹر علی محمد خسرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے علاوہ وزیر اعلیٰ اتر پردیش ہیم وتی نندن بہوگنا بھی شریک جشن تھے جبکہ پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ اسی پچاسی سالہ جشن تعلیمی نے عالمی سطح پر اور وسیع پیمانے پر اس تحریک کا تعارف کرایا اور ملکی سطح پر بھی ان حلقوں سے جواب تک اس کی صدا سے متوحش اور اس کے پیغام سے ناآشنا تھے، غلط فہمیاں دور ہوئیں (۲۱)۔

جشن تعلیمی کے ڈیڑھ سال بعد ہی ۳/فروری ۱۹۷۷ء کو امام حرم مکی و خطیب عرفات شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ اپنے رفقاء کے ساتھ ندوہ تشریف لائے۔ یکم نومبر ۱۹۸۶ء کو امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل اور رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سعودی سفیر کے ساتھ دارالعلوم کا مشاہدہ کرنے آئے۔ اس عرصہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ندوۃ العلماء کی شہرت عالم اسلام میں اس قدر ہو گئی کہ ۲۴/صفر ۱۴۰۰ھ کے جلسہ سعودی عرب میں

۱۹۸۶ء) جب ندوۃ العلماء کے منصب اہتمام سے دل برداشتہ ہوکر مستعفی ہو گئے (۲۵) تو بھوپال وطن مالوف میں انھوں نے اپریل ۱۹۵۰ء میں دار العلوم تاج المساجد کی بنیاد رکھی جس میں ندوہ ہی کا نصاب تعلیم اور منہج تعلیم نافذ ہوا جس کے بارے میں بانی مرحوم نے خواب دیکھا تھا کہ ایک دن یہ ادارہ ہندوستان میں ازہر کا مقام حاصل کرلے گا۔ جنوبی ہندوستان میں علوم دینی کی ترویج واشاعت اور مسلمانوں میں عام مذہبی بیداری کے لحاظ سے اس ادارہ نے گراں قدر خدمات انجام دیں (۲۶)۔

مولانا عمران خان کا دوسرا بڑا کارنامہ تاج المساجد کی تکمیل ہے۔ یہ مسجد سابق ریاست بھوپال کی چوتھی خاتون حکمراں نواب شاہجہاں بیگم کے منصوبوں کی تعبیر ہے اس کی بنیاد ۱۸۸۷ء میں انھوں نے رکھی جو ۱۹۰۱ء میں ان کی رحلت تک مکمل نہ ہوسکی۔ چودہ برس تک جاری رہنے والے پتھر پر نقش نگاری اور سنگ تراشی کے صبر آزما کام میں ہزاروں کاریگر اور مزدور لگے رہے تب نصف کے قریب مسجد تعمیر ہوسکی۔ بعد میں مسجد کا ایک دروازہ شاہجہاں بیگم کے نواسے اور والی ریاست نواب حمید اللہ خان نے بنوایا لیکن ان کی ہمت بھی جواب دے گئی اور تقریباً پچاس سال تک نہایت کسمپرسی کی حالت میں رہنے کے بعد مولانا عمران خان نے اپنے شیخ شاہ محمد یعقوب مجددی کی حوصلہ افزائی سے ۳۵ سالہ شب وروز محنت کے نتیجہ میں برادر اصغر مولانا محمد سلمان خان ندوی کے تعاون سے اس مسجد کو ۱۹۵۸ء میں دوکروڑ روپے کے صرفہ سے پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ اس عرصہ میں ۱۹۴۸ء سے یہاں سالانہ تبلیغی اجتماع بھی ہوتا رہا اور اس میں ملک و بیرون ملک کے تبلیغی وفود لاکھوں کی تعداد میں آکر شرکت کرتے رہے (۲۷)۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں دار العلوم کی بنیاد مسجد شکور خان میں پڑی۔ تین ماہ کے بعد ہی دار العلوم تاج المساجد کے نئے نام سے اپنے موجودہ احاطہ میں یہ ادارہ منتقل ہوگیا۔ اس ادارہ نے دینی تعلیم کی توسیع کی غرض سے ۱۹۹۰ء سے ریاست کے مختلف مقامات پر اپنی شاخوں کی تنظیم کا آغاز کیا جن کی تعداد اس وقت تیس ہے۔ ان میں ابتدائی دینی تعلیم اور قرآن مجید ناظرہ وحفظ کا انتظام ہے۔ وہاں سے نکل کر ان طلبہ کو دار العلوم میں داخلہ مل جاتا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے سروے کے مطابق ایک ہزار سے زائد طلبہ دار العلوم سے فارغ ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۷ء سے قبل یہاں کے طلبہ کو ڈگری نہیں دی جاتی تھی اور وہ اندرون ملک یا عرب ممالک میں جاکر اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے تھے۔ تقریباً پندرہ سو سے زائد طلبہ یہاں سے حفظ قرآن مکمل کر چکے ہیں (۲۸)۔

xxxxxxxxxxxxxxxxxx

تعلیقات وحواشی:

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، استاذ العلماء، ص ۴۲

(۲) سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء م لکھنو، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۹۔۱۳۱

(۳) روائداد ندوۃ العلماء سال اول، حصہ اول ص ۱۴

(۴) سید محمد الحسنی، حوالہ بالا، ص ۱۵۷

(۵) نفس مصدر، ص ۱۵۷

(۶) نفس مصدر، ص ۱۹۴۔۱۹۵

(۷) سید محمد الحسنی اپنی سیرت مونگیری میں مولانا شبلی کے نظریات وافکار اور دلائل سے بحث کرتے وقت انصاف سے کام لیتے نظر نہیں آتے تاہم وہ بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ شبلی کی ذہنی وفکری نشو ونما میں علی گڑھ کا خاصہ حصہ تھا۔ مگر علی گڑھ کے مفید ومضر رجحانات میں وہ پوری تمیز رکھتے تھے۔ اور ان کی روشن خیالی اور علمی وادبی بلندی اور آزاد فکری ارباب ندوہ کے لئے قابل قبول نہ ہو سکی۔ دیکھئے: ص ۲۷۲۔۲۸۸

(۸) نفس مصدر، ص ۱۶۳

(۹) تفصیل کے لئے دیکھئے: نفس مصدر، ص ۱۷۰۔۱۷۸۔ تحریک ندوہ کے خلاف مولانا احمد رضا خاں نے جو رسائل لکھے ان کی تعداد دو سو بتائی جاتی ہے۔ مولانا منظور نعمانی کے بیان کے مطابق کسی مخالف نے اس کام کے لئے ستر ہزار روپیہ بھی وقف کیا۔ فاضل بریلوی کے علاوہ دوسرے سنی علماء کی طرف سے اس مہم میں جو مخالفانہ کتب شائع کی گئیں وہ چالیس سے زیادہ تھیں۔ ہجو یہ قصیدہ تک کہے گئے جیسے دو شعر ملاحظہ ہوں:

جو ہو خود عین ضلالت یہ بنائے ندوہ — کیا زمانہ کو راہِ راست پر لائے ندوہ

پیر نیچر کی یہ ہے شعبدہ بازی ساری — آگ لگ جائے اسے، بھاڑ میں جائے ندوہ

(جذوہ لرجوم احزاب دار الندوۃ ص ۳۲)

(۱۰) نفس مصدر، ص ۱۵۳

(۱۱) نفس مصدر، ص ۱۵۵

(۱۲) نفس مصدر، ص ۲۰۰۔۲۰۱
(۱۳) مولوی شمس تبریز خان، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم، لکھنؤ، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء، ص ۱۳۷
(۱۴) نفس مصدر، ص ۴۸۵
(۱۵) بلال عبدالحئ حسنی، سوانح مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء، ص ۱۹۵، ۱۹۹
(۱۶) مولوی شمس تبریز خان، حوالہ بالا، ص ۴۰۳
(۱۷) مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول، لکھنؤ، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء ص ۳۱۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ''الندوۃ'' رسالہ کے جو علمی نتائج بیان کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:
(۱) اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا۔
(۲) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔
(۳) علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔
(۴) عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔
(۵) اسلام اور تاریخ اسلام پر سے، بہت سے اعتراضات کو دفع کیا۔
(۶) قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔
(سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، اعظم گڑھ، ص ۴۴۷)
(۱۸) مولوی شمس تبریز خاں، حوالہ بالا، ص ۴۲۲۔۴۲۳
(۱۹) البعث الاسلامی میں مولانا محمد الحسنی کے اداریئے بڑے مقبول ہوئے۔ ان مضامین کا ایک مجموعہ ''الاسلام الممتحن'' کے نام سے عرب ممالک میں شائع ہوا۔ ان زلزلہ خیز اداریوں نے صحیح الفکر عربوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ فاضل مدیر کی طبیعت میں دراصل عالم عربی کی مادہ پرستانہ زندگی اور اسلام گریز مادی تحریکوں کے وجود نے ایک شدید کشمکش برپا کر دی اور ان کا قلم ایک ایسے آبشار میں تبدیل ہو گیا جو مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بقول ''چٹانوں سے ٹکرانے کی

وجہ سے ابلتا ہے اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ گرتا ہے" اس کے نتیجے میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے" (تعمیر حیات، خصوصی شمارہ، ۱۹۸۰، ص ۱۶۷)

(۲۰) مولانا محمد الحسنی، روداد چمن، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸۔۱۹

(۲۱) بلال عبدالحئ حسنی ندوی، حوالہ بالا، ص ۳۳۷

(۲۲) نفس مصدر، ص ۳۶۷

(۲۳) نفس مصدر، ص ۳۳۹

(۲۴) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی لکھنؤ جلد دوم، ص ۳۲۸

(۲۵) مولانا محمد عمران خان ندوی کے استعفی کے پس پشت مولانا عبدالسلام قدوائی کی حاسدانہ کاروائی اور مولانا ابوالحسن ندوی کی ذاتی ناپسندیدگی کو بھی بڑا دخل تھا۔ دراصل ایک میان میں دو تلواروں کی تنازع للبقا نے صورت حال کو بڑا کشیدہ بنا دیا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، حیات عمران جلد اول، بھوپال، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۳۔۱۸۷، اور تحقیقاتی رپورٹ ندوہ ہڑتال ۱۹۴۳ء پر مشتمل ضمیمہ ص ۲۰۹۔۲۳۱

(۲۶) نفس مصدر، ص ۱۸۶، نیز ڈاکٹر رضیہ حامد و رفعت سلطان (مرتبہ)، نقوش بھوپال، باب العلم پبلی کیشنز بھوپال، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۶، ۴۹۷

(۲۷) مسجد کی تعمیری خصوصیات کے لئے دیکھئے، عارف عزیز، مساجد بھوپال، اقرا پبلشنگ ہاوس بھوپال، اشاعت ثانی، نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۷۔۱۱۸

(۲۸) ڈاکٹر محمد حسان خاں، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال ایک تعارف، بھوپال، اشاعت ہشتم فروری ۲۰۰۲، ص ۱۳

××××××××××××××××××

باب ششم

مدرسۃ الاصلاح

انجمن اصلاح المسلمین:

صوبہ اتر پردیش اعظم گڑھ اور شاہ گنج (جونپور) کے درمیان واقع سرائے میر ریلوے اسٹیشن کے شمال میں تقریباً ایک کلومیٹر کی مسافت پر واقع مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد سیدھا سلطان پور (سرائے میر سے متصل ایک گاؤں) کے ایک درویش صفت عالم مولوی محمد شفیع داناپوری مرحوم نے ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں رکھی اور اس کا افتتاح مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کیا۔ اس مدرسہ کی تاسیس دراصل ''انجمن اصلاح المسلمین'' کی اصلاحی و تبلیغی مساعی کا نقطۂ عروج تھا۔ غالباً فروری ۱۹۰۴ء میں مولوی محمد شفیع مرحوم نے مقامی علماء، مسلمان زمینداروں اور علم دوست احباب سے مل کر اصلاح معاشرہ اور ردّ بدعات کے لئے یہ انجمن قائم کی تھی (۱)۔ اس کے سالانہ '' جلسوں میں مولانا عبدالحق حقانی دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا امین نصیر آبادی، مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ قدرت اللہ، مولانا محمد اسماعیل اور مولانا محمد سیف بناری جیسے علماء و مشاہیر تقریریں کیا کرتے تھے (۲)۔ انجمن کا ایک مقصد ''مذہبی و دنیاوی تعلیم کی غرض سے جابجا مدارس کا اجراء اور موجودہ تعلیم گاہوں کی اصلاح اور اعانت بھی تھا (۳)۔'' اعظم گڑھ کے مواضعات و قصبات میں ہونے والے یہ جلسے مقامی علماء، روساء اور دیندار مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنتے گئے اور تائید و توثیق کے طور پر دستخطی مہم بھی چلائی گئی۔ اس انجمن کو چندہ دینے والوں میں ہر طبقہ و پیشہ کے لوگ تھے۔ عوام و خواص کا جذبہ بے اختیار اور شوق قابل دید تھا۔

بانی انجمن مولوی محمد شفیع مرحوم نظر میں وسعت اور طبیعت میں اعتدال رکھنے والے صاحب دل بزرگ تھے۔ ''نہ ان میں متقشف علماء کا سا جمود اور گروہی عصبیت تھی نہ تنگ نظری اور خوردہ گیری۔ وہ اپنے تعلیمی خیالات سے لیکر فقہی مسلک تک وسیع النظر، وسیع القلب اور معتدل تھے۔ ایک طرف ان کے تعلقات قدیم طرز کے مشائخ سے تھے تو دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ

طبقے سے بھی۔ ان کے احباب میں علماء کے علاوہ ادباء وشعراء بھی تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں جہاں انھوں نے وقت کے جید اساتذہ مولانا فیض اللہ مئوی، علماء صادق پور اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے کسب فیض کیا وہاں وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے شعراء کی صحبتوں میں بھی بیٹھے (۴)۔"

مدرسہ اصلاح المسلمین:

مولوی محمد شفیع مرحوم کو اصلاح معاشرت اور ترک بدعات کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے ایک مرکز کی ضرورت محسوس ہوئی تو اعظم گڑھ کے طول وعرض میں کسی مدرسہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے فوری طور پر ایک دینی تعلیمی ادارہ کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ علاقہ کے روساء نے اپنی زمینیں مدرسہ کے لئے وقف کردیں اور چھپر ڈال کر "مدرسہ اصلاح المسلمین" کا آغاز کردیا گیا۔ بعد میں مولوی عبدالاحد (منجیر پٹی) اور مولوی غنی نے بھی مدرسہ میں تعلیم دینی شروع کی اور عربی کی کچھ کتابیں داخل نصاب ہوگئیں اور اس طرح اسے ایک باقاعدہ عربی مدرسہ کی شکل حاصل ہوگئی۔

بانی واولین ناظم مدرسہ اصلاح المسلمین نے انتہائی بے غرضی اور اخلاص کے ساتھ بغیر کسی ذہنی تحفظ کے علامہ شبلی نعمانی سے درخواست کی کہ وہ مدرسہ کی رہنمائی وسرپرستی فرمائیں۔ وہ اس وقت ندوۃ العلماء میں معتمد تعلیم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے عزیز شاگرد اور ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳۔۱۹۳۰ء) کو ۲۹ر اپریل ۱۹۱۰ء کو، جو اُن دنوں دار العلوم حیدر آباد کے پرنسپل تھے، ایک خط میں لکھا کہ "کیا تم سرائے میر کے مدرسہ میں چند روز قیام کرسکتے ہو۔ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم ونسق درست کردیا جائے (۵)۔" مولانا شبلی نعمانی نے ابتدائی اغراض ومقاصد کا تعین کیا اور اجمالی خاکہ تیار کرکے اس میں رنگ بھرنا شروع کردیا۔ ۲۳ر جون ۱۹۱۲ء کے جلسہ انتظامیہ نے مولانا فراہی کو باقاعدہ مدرسہ کا ناظم منتخب کیا۔ دو سال کے بعد ۲۷ر ستمبر ۱۹۱۴ء کے جلسہ انتظامیہ میں بوجہ ضعف پیری مولانا نے نظامت ترک کرکے گویا اس فیصلہ کو خود نافذ کردیا۔ اس دوران انھوں نے مولانا شبلی کو اس منصب کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی مگر شبلی نے ۲۱ر ستمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں اس سے معذوری ظاہر کی کیونکہ ندوہ کے معاملات سے وہ کافی دل شکستہ تھے، البتہ سرپرستی اور امکانی مدد کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔ اُن کی

عمر نے وفا نہ کی اور ۱۸ ر نومبر ۱۹۱۴ کو شبلی کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران مولوی محمد شفیع نائب ناظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مولوی مسعود علی ندوی کو بھی نظامت کی ذمہ داری نبھانے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی آخر کار ۱۰ر جون ۱۹۱۵ء کو انھیں نائب ناظم مقرر کر دیا گیا۔ اس دوران ناظم کا عہدہ خالی رہا۔ دو سال کے بعد ۲۸ رمئی ۱۹۱۵ء کو جلسۂ انتظامیہ نے مولانا حمید الدین فراہی کو ناظم مقرر کیا اور وہ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء کو وفات تک اس منصب پر پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقد جلسۂ انتظامیہ نے اُن کے چھوٹے بھائی حاجی رشید الدین کو ناظم مدرسہ منتخب کیا (۶)۔

مدرسۃ الاصلاح اور مولانا فراہی:

مولانا فراہی کی سرپرستی ورہنمائی میں ''مدرسہ اصلاح المسلمین'' نے اغراض ومقاصد، دستورالعمل اور منہاج تعلیم ونصاب کا ایک واضح رخ اور صحیح سمت متعین کیا جس میں شبلی کے افکار ونظریات کا انعکاس بھی تھا مگر غالب حصہ مولانا فراہی کی فکر، منہج اور مفصل خاکے کا تھا۔ اسی دور میں ۲۸ رفروری ۱۹۲۷ء کو مجلسِ عاملہ نے ادارہ کا نام بدل کر ''مدرسۃ الاصلاح'' رکھ دیا اور یہ نام تاریخ میں بقائے دوام حاصل کر گیا (۷)۔ دراصل مدرسۃ الاصلاح کو بنایا، سنوارا اور ترقی کے عروج پر پہونچایا مولانا فراہی نے ''مدرسہ کے تخیل کی تعیین اور اس تخیل کے مطابق مدرسہ کو چلانا، اس کا نصاب درس بنانا، مدرسوں کو اپنے انوکھے خیال سے متفق کرنا، خاص طلبہ کو اپنے مذاق کی تعلیم دینا اور پورے مدرسہ کو اپنے نہج کے مطابق لے چلنا خاص انہی کا کام تھا (۸)''۔

اگست ۱۹۱۹ء کے اواخر میں دارالعلوم کالج حیدرآباد کے منصب پرنسپل سے مستعفی ہو کر مولانا فراہی وطن پھر یہا، اعظم گڑھ واپس آ گئے اور مدرسۃ الاصلاح کو اپنے منہج وفکر اور تخیل کے مطابق پروان چڑھانے کے لئے یکسو ہو گئے۔

مولانا فراہی نے اپنے قلم سے مدرسہ کے دستورالعمل میں اس کی غایت اور مشن کی وضاحت کی ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

دفعہ ۴: اصل مقصد اس مدرسہ کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔

دفعہ ۵: انتظام تعلیم میں یہ مدرسہ خصوصیات ذیل ہمیشہ پیش نظر رکھے گا۔

(الف) قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتناء

(ب) اصل علم وقابلیت کومطمح نظر رکھنا نہ کسی محدود نصاب کتب کو الا قرآن مجید ومتون حدیث

(ج) درستی اخلاق یعنی پابندیٔ شرائع وروحانیت اسلام

(د) آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت

(ہ) کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ" (۹)

مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴۔۱۹۹۷ء) نے مدرسہ کے اغراض ومقاصد کی تشریح فکر فراہی کی روشنی میں کرتے ہوئے لکھا:

(۱) مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ غریبانہ ومذہبی زندگی بسر کریں۔ اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں۔ کفاف پر قناعت کریں۔ چنانچہ یہاں صدر مدرس و مہتمم ۳۵/روپے ماہوار پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بقیہ اساتذہ بیس بیس، پچیس پچیس روپے ماہوار پاتے ہیں۔ یہ بھی اس طرح کہ بعض مرتبہ سال بھر میں ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کا سامان نہیں ہوتا۔

(۲) اس مدرسہ کو غرباء مسلمین کی اعانت سے چلایا جائے۔ سرکاری اثر سے آزاد رکھا جائے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے اوقاف کے علاوہ اس مدرسہ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے حالانکہ اس حالت سے نکل جانا باآسانی ممکن نہ تھا۔ مگر مولانا (فراہی) کا خیال تھا کہ آزادی اور دینی روح کا تحفظ اصل الاصول ہے۔

(۳) قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو۔ اس کے بعد حدیث و فقہ پر زور دیا جائے۔ منطق وفلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں۔ ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دی جائے۔ حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو۔ فقہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو۔ تکفیر وتفسیق کا ولولہ نہ ابھرے۔ صرف ونحو کی تعلیم عملی ہو۔ فنون کی تعلیم میں امہات فن پیش نظر رہیں اور لیکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے (بشرطیکہ صدقات وخیرات کی رقمیں اس پر صرف نہ کی جائیں) حصول معاش کے لئے صنعت کی تعلیم دی جائے۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔

(۴) یہ مدرسہ اہل السنّت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو۔ یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں۔ ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر شیر وشکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں (۱۰)۔

قرآن کی محققانہ تعلیم:

مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہی کے انتقال کے بعد اپنے تعزیتی مضمون میں مدرسۃ الاصلاح کے مشن اور نصب العین سے متعلق مدرسہ کی مطبوعہ روداد سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو مولانا فراہی کا تحریر کردہ ہے یا ان کی فرمائش سے لکھا گیا اور ان کا اصلاح کردہ ہے۔ مولانا فراہی کہتے ہیں:

''............ان حالات میں خدا نے ایک جماعت کو اپنی توفیق بخشی سے سرفراز کیا اور اس نے طے کرلیا کہ جس اسلوب پر علوم دینیہ کی تعلیم ہورہی ہے وہ قطعی ناقص اور غیر منتج ہے۔ جب اسلام ہماری دینی اور دنیاوی فلاح کا جامع ہے تو اسلامی تعلیم کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ نہ صرف ہماری عبادات کا دستور العمل ہو بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہو۔ اب ہمارے درد کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ محض رسمی تعلیم ونصاب مروّج کو ختم کرنا نہیں بلکہ مذہبی تعلیم کو اس کے صحیح معنوں میں جاری کرنا ہے، یعنی وہ وسعت وجامعیت جو اسلام کا مفہوم ہے اور ''تفقہ فی الدین'' اسی سے عبارت ہے۔ اس جماعت نے اس بلند معیار تعلیم کو پیش نظر رکھ کر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے۔

.........مدرسۃ الاصلاح کا دعوٰی ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لئے آلہ اور وسیلہ ہوسکتے تھے ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس وتدریس کے لئے انھوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی کہ محض تلاوت وحفظِ الفاظ پر اکتفا کرلیا گیا اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی۔

﴿يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْرًا﴾

(اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے۔)

لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت وترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم کو اس کی تعلیم کے ماتحت کردی۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق وحکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن مجید کی روشنی میں، اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔" (۱۱)

مدرسۃ الاصلاح نے تعلیم وتربیت کا جو خصوصی منہج اختیار کیا اس میں فقر واستغنا، اخلاص وایثار، محنت وریاضت، صبر وقناعت، بے نفسی اور بے لوثی، سادگی وصفائی، بلند ہمتی، سیر چشمی اور اولوالعزمی، حق گوئی وبیباکی، عزت نفس، غیرت وحمیت، اور اس کے ساتھ ساتھ عقل وتمیز، شائستگی وتہذیب کے اوصاف وجواہر کو امتیاز حاصل ہے (۱۲)۔ یہ ثمر ہے ان روایات، افکار واقدار کا جن کو بانیان ومخلصین مدرسہ نے اس مخصوص فضا میں پروان چڑھایا۔ یہ منہج بوجوہ انفرادیت کا حامل ہے۔

(۱) قرآن مجید کی تعلیم کے لئے کسی خاص تفسیر کا انتخاب نہیں کیا گیا بلکہ خود قرآن کی مدد سے اس کی تفہیم وتشریح پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سے تدبر قرآن کی راہ کھلتی ہے اور ہر مفسر کے نظریات وخدمات سے استفادہ ممکن ہوتا ہے۔

(۲) حدیث وسنت کو قرآن کی روشنی میں اور اس کی تبیین سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے۔

(۳) فقہ کی تعلیم مسلکی عصبیت سے بلند ہو کر مجتہدانہ شان کے ساتھ دی جاتی ہے۔

(۴) قرآن وحدیث کی تعلیم میں ادب جاہلی سے استدلال اس مدرسہ کی خصوصیت ہے۔

(۵) عربی زبان کی تعلیم نحوی وصرفی تمرینات اور مشق وممارست کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اور ہوم ورک کا خاصہ اہتمام کیا جاتا ہے (۱۳)۔

(۶) طلبہ جماعت میں حاضری سے پہلے زیر درس سبق کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ لغات کی مدد سے مشکل عبارتیں حل کرتے ہیں اور درس کے وقت استاذ کی رہنمائی سے قبل اپنا حاصل مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

(۷) آزادی فکر کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ بحث ومباحثہ اور مذاکرہ کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہو اور انشراح قلب کے ساتھ طلبہ کوئی رائے قائم کریں۔

فکر فراہی کی پیروی:

مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول ہم لوگوں نے مولانا فراہی کو بھی معصوم نہیں سمجھا اور "انھیں اربابا من دون اللہ کی حیثیت دے کران کے ہر قول وفعل کو اپنے لئے اسوہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ زندہ تھے ان کی مجلسوں میں ان کی تحقیقات پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے (اگر گنجائش دیکھتے تھے) اوران کی وفات کے بعد، ان کی تحقیقات پر اسی طرح بحث ونظر کرتے ہیں جس طرح تمام محققین کی تحقیقات پر" (۱۴)۔ مولانا فراہی کے اس طریقہ فکر وعمل نے مدرسہ کی علمی فضا میں آزادانہ رائے اور حریت فکر کی پاسبانی کی اور مرعوبیت اور اندھی تقلید کے چور دروازوں کو بند کر کے رکھا۔ اسی سے اصلاحی فضلاء میں ذوق تحقیق کو مہمیز ملی اور انھوں نے علوم وفنون کا ناقدانہ مطالعہ کیا۔

مدرسۃ الاصلاح کے مصارف کی تکمیل کے لئے مولانا فراہی نے روایتی ذرائع آمدنی سے کام تو لیا مگر ان پر مکمل انحصار نہ کیا۔ عطیوں اور چندوں کی وصولی کے لئے وہ طلبہ واساتذہ سے خدمت لینے کے قائل نہ تھے۔ اس کام کے لئے انھوں نے الگ سے سفیروں کی تقرری کی اور متبادل ذرائع بھی تلاش کئے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو جلسہ انتظامیہ نے جس میں مولانا فراہی شریک تھے، آٹا پیسنے کی مشین لگانے کا فیصلہ کیا۔ یہ مشین عام طور سے شام کو چلتی تھی۔ مدرسہ کے دارالاقامہ میں رہائش پذیر سینکڑوں طالب علموں کی دونوں وقت کی ضرورت کا آٹا اسی مشین میں پستا تھا۔ اس کے علاوہ گردوپیش کے دیہات ومواضعات کے لوگ بھی یہیں سے آٹا نکلواتے تھے۔ جفت سازی کا کام بھی، گو مختصر پیمانے پر ہوتا تھا، اسی طرح جلد سازی کی بھی ایک دوکان تھی۔ مدرسہ کے کتب خانہ اور دارالمعلومات کی کتابوں کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ بھی اجرت دے کر یہاں کام کرواتے تھے۔ اس طرح کے کاموں کا مقصد مدرسہ کو خودکفیل بنانے کے علاوہ طلبہ کو کوئی ہنر سیکھنے کا موقع بھی فراہم کرنا تھا۔

خودکفالتی کی بنیاد پر ذرائع آمدنی کو مستحکم کرنے کے لئے مولانا فراہی نے شہر اعظم گڑھ میں سودیشی کپڑوں کی ایک دوکان بھی کھلوائی تھی جس میں ان کے علاوہ ضلع کے دوسرے مخیّر حضرات بھی شریک تھے۔ مولانا کی زندگی نے وفا نہ کی اوران کے شروع کئے ہوئے منصوبے ان کے ساتھ ہی بند ہو گئے۔ انھوں نے قوم کی طرف سے تعاون اور امداد وصول کی مگر حکومتِ وقت کی

اعانت سے ہمیشہ دست کش رہے (۱۵)۔ عطیات اور چندوں کو قبول کرنے میں حرام وحلال کا لحاظ رکھا۔ سود کے چندے مسترد کردیئے۔ ۱۹۲۴ء میں ڈپٹی عبدالغنی نے پانچ ہزار کی خطیر رقم مدرسہ کو بطور عطیہ اس شرط کے ساتھ دینے کی خواہش کی کہ رقم بینک میں محفوظ کردی جائے اور اس کے سود سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مولانا فراہی نے انھیں جواباً لکھوایا کہ ''سود بینک کا ہو یا کسی قسم کا، وہ مطلقاً حرام ہے اور مدرسہ کو اس سے معاف رکھا جائے'' (۱۶)۔

مدرسہ کے لئے مالیات کی فراہمی کے لئے ۱۹۲۴ء ہی میں ضلع کے ایک مشہور زمیندار حاجی حسن علی اور ایک آدھ طالب علم کے ہمراہ مولانا فراہی نے برما کا سفر کیا اور کامیاب واپس ہوئے۔ مگر عام طور پر ان کا رویہ بے نیازی اور توکل ہی کا ہوتا تھا۔ وہ غیرت اور استغنا کو مدرسہ کی شان تصور کرتے تھے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کا مدرسہ ''اوساخ اموال الناس'' پر چلے (۱۷)۔ مولانا سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ مولانا فراہی ''علماء کی گداگرانہ خصلت سے سخت نفرت رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولویوں کے مدرسہ سے بھی گداگری کی لعنت دور ہوجائے۔ چنانچہ انھوں نے مدرسہ کے لئے جائداد خریدی جس کا سال بہ سال منافع آتا ہے'' (۱۸)۔

علوم قرآنی کی توسیع:

۱۹۳۶ء میں مدرسۃ الاصلاح نے میدان صحافت میں قدم رکھا اور مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں ماہنامہ ''الاصلاح'' جاری کیا۔ یہ علمی و تحقیقی رسالہ ۱۹۳۹ء تک شائع ہوتا رہا اس میں قرآنیات پر نہایت اعلیٰ معیار کے مقالات شائع ہوئے۔ اس لحاظ سے اسے قرآنیات کا اختصاصی رسالہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت مولانا فراہی کے افکار و خیالات کی اشاعت بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی کتابوں کے اردو تراجم اولاً بالاقساط ''الاصلاح'' ہی میں شائع ہوئے۔ مولانا کے نہج پر جن لوگوں نے تدبر و تحقیق کا کام کیا اس کے نتائج فکر بھی اس کے اوراق کی زینت بنے۔ اس طرح اس رسالہ نے ایک ایسی جماعت کی تیاری میں بڑا اہم کردار ادا کیا جو مولانا فراہی کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھا سکتی تھی (۱۹)۔ ''مولانا امین احسن اصلاحی کے مدرسے سے تشریف لے جانے کے ایک سال بعد مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی نے ''اصلاح'' نامی دوسرا رسالہ نکالا لیکن بدقسمتی سے اس کی اشاعت کا سلسلہ بھی ایک سال سے زائد جاری نہ رہ سکا (۲۰)۔'' اسی مشن کی تجدید کے لئے ۲۰۰۰ء میں ادارہ نے مولانا محمد ایوب اصلاحی

کی ادارت میں سہ ماہی نظام القرآن کا اجراء کیا۔ جس کا پہلا شمارہ محرم۔ ربیع الأول ۱۴۲۱ھ /اپریل۔ مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ مدیر مسئول مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مدیر معاون محمد عمر اسلم اصلاحی اور نسیم ظہیر اصلاحی اور مدیر انتظام انیس احمد اصلاحی ہیں۔ مدیر محترم نے اداریہ میں رسالہ کو مدرسۃ الاصلاح کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی قرار دیا۔ اور افادات فراہی شائع کرتے رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ رسالہ علمی و تحقیقی نوعیت کا ہے اور برابر شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۳۶ء میں فکر فراہی کی اشاعت و توسیع کے لئے ایک اشاعتی ادارہ ''دائرۂ حمیدیہ'' قائم کیا گیا جس کے اولین ناظم مولانا امین احسن اصلاحی تھے ان کے بعد مولانا اختر احسن اصلاحی (۱۹۰۲ء۔۱۹۵۸ء) نے اس ادارہ کی نظامت کی ذمہ داری نبھائی۔ آپ نے انتقال سے پہلے یہ امانت مولانا بدر الدین اصلاحی (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۶ء) کے سپرد کی جو اپنی وفات تک پورے ۳۵ سال اس ادارہ کے امین رہے۔ انھوں نے اپنے دور میں اس ادارہ سے مولانا فراہی کے آٹھ مخطوطات کی جمع و تدوین اور طباعت کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی نے اس کشتی کے پتوار سنبھالے۔ یہ ادارہ اگر اپنی رفتار بڑھا دے تو مولانا فراہی کی نادر تعلیقات اور مخطوطے جلد از جلد علمی دنیا کے سامنے آجائیں۔ کیونکہ ''مولانا فراہی کی فکر اور ان کا تیار کردہ عظیم الشان قرآنی لٹریچر عام پڑھے لکھے لوگوں تک پہونچنے پہونچانے کا معاملہ تو الگ رہا بیشتر اہل علم کی دسترس سے بھی باہر ہے جو کتابیں کبھی شائع ہوئی تھیں اب وہ نایاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کو نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ انکی فکر اپنی پوری توانائی اور حیات بخش امکانات کے ساتھ سامنے نہیں آسکی ہے بلکہ پوری صورت حال سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بعض حلقوں میں شدید غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں۔ جنھیں دیکھ کر عقل حیران ہے اور خامہ انگشت بدنداں۔ (۲۱)'' یہ ادارہ کی خوش قسمتی تھی کہ اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں بکھرا کے ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ سول سرجن کا عملی و مادی تعاون اسے آغاز ہی میں حاصل ہو گیا اور وہی دائرہ حمیدیہ کے اولین صدر بنائے گئے اور مولوی عبد الغنی انصاری نائب صدر۔ پریس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری حافظ عبد الأحد اصلاحی (۱۹۱۰ء۔۱۹۴۱ء) اور مولانا عزیز الرحمٰن اصلاحی (۱۹۰۹ء۔۱۹۷۱ء) کے سپرد ہوئی۔ دائرہ حمیدیہ کو بعد کے مراحل میں تعاون دیا حاجی رشید الدین، شیخ محمد سجاد، محمد عباد، محمد فاروق نعمانی، شیخ محمد سلیمان اور مولوی حمید انصاری وغیرہ مخلصین

نے۔ مگر علمی حلقوں میں اس کا تعارف کرایا مولانا امین احسن اصلاحی نے۔ کاش یہ ادارہ متحرک ہو جائے اور اہل علم و مخلصین کا تعاون اسے پھر مل جائے۔

مدرسۃ الاصلاح کے چند فضلاء ایسے ہیں جن کا ذکر کئے بغیر ہندوستان میں علوم اسلامیہ اور دعوت دین کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ہے جیسے مولانا اختر احسن اصلاحی ادب عربی اور قرآن کریم کے بہترین معلم، مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۹۷ء) صاحب تدبر قرآن، مولانا نجم الدین اصلاحی (۱۹۰۴ء۔ ۱۹۹۴ء) صاحب دلائل السنن والآثار اور مکتوبات شیخ الاسلام (چار جلدوں) کے مرتب، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۴ء) جو جماعت اسلامی ہند کے تقریباً تیس سال تک امیر رہے۔ مولانا بدرالدین اصلاحی جو مولانا فراہی کے مطبوعہ کتابوں کے جامع و مدون ہیں۔ مولانا صدرالدین اصلاحی (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۸ء) تفہیم القرآن کے ملخص اور معروف مصنف و ادیب، مولانا داؤد اکبر اصلاحی (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۸۳ء) قرآنیات کے محقق، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ''ذکر فراہی'' کے مصنف، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر معارف اعظم گڑھ، مولانا محمد یوسف اصلاحی مدیر ذکریٰ رامپور، اسلامی معاشیات کے مصنف ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی مدیر علوم القرآن، علی گڑھ، مولانا عزیز الرحمٰن اصلاحی (م ۱۹۷۱ء) مدیر رسالہ ''کونین'' اور مولانا سلطان احمد اصلاحی سماجی مسائل کے معروف قلم کار، مولانا ابوبکر اصلاحی سابق ناظم جامعۃ الفلاح، مولانا عبدالحسیب اصلاحی (سابق صدر مدرس جامعۃ الفلاح) مولانا شبیر احمد اصلاحی (سابق صدر مدرس جامعۃ الفلاح) منہاج الدین اصلاحی ایڈیٹر روزنامہ کوہستان و مالک شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ابوصالح اصلاحی چیف ایڈیٹر روزنامہ کوہستان و مشرق لاہور، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی (۱۹۲۰ء۔ ۱۹۸۴ء) مصنف مخدوم علی مہائمی، ''حیات و افکار''، مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی ناظم دائرہ حمیدیہ وغیرہ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس ادارہ نے نامور مصنف، انشاپرداز، صحافی، شاعر، خطیب، معلم، مفسر اور ادیب پیدا کئے اور تحریک اسلامی ہند کو تصنیف و تحقیق اور قیادت و تنظیم کی صفات سے مزین خادم دین و ملت فراہم کئے (۲۲)۔

مدرسۃ الاصلاح کا سب سے بڑا کارنامہ نظم قرآن کی روشنی میں قرآن پاک کی محققانہ تشریح و ترجمانی ہے۔ مولانا فراہی کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ قرآن کریم سے

ان کی دوری اور اس سے وابستگی میں کمزوری ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ فہم قرآن کی راہ ہموار کی جائے اور قرآن سے مسلمانوں کے تعلق کو مضبوط بنایا جائے۔ فہم قرآن کی یہ راہ ان کے نظریہ نظم القرآن کے اطلاق وانطباق کے بغیر باز نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے منہج کے مطابق تفسیر کا کام شروع کر دیا اور متعدد سورتوں (فاتحہ، ذاریات، تحریم، قیامہ، مرسلات، عبس، والشمس، والتین، والعصر، فیل، کوثر، کافرون، لھب اور اخلاص) کی عربی زبان میں تفسیر کی۔ جس نے نظم قرآن کے کامیاب انطباق کا عملی نمونہ فراہم کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بعد میں اردو زبان میں ''تدبر قرآن'' کے نام سے پورے قرآن کی تفسیر منہاج فراہی کی روشنی میں پیش کر کے تفسیری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ تدبر قرآن کا بڑا کارنامہ ان قرآنی اصطلاحات و شعائرِ اسلام کی محققانہ تفہیم ہے جس نے غلط افکار و تصورات کے استیصال اور صحیح اسلامی فکر کے استحکام میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صفا، مروہ، صبر، توکل، شکر، تقویٰ، اللہ، رب، عبادت، دین، شریعت، معروف، منکر، سعی، طواف، صدقہ وغیرہ اصطلاحات کا مفہوم قرآن اور سنت متواترہ کی روشنی میں بیان کر کے منکرینِ حدیث کی لفظی بھول بھلیوں کا راستہ بند کر دیا ہے۔ کیونکہ ان تمام اصطلاحات اور ان سے متعلق اعمال و کیفیات کو سلف سے لے کر خلف تک امت مسلمہ نے پوری طرح محفوظ رکھا ہے۔ اور اگر کسی اصطلاح کی پوری حد و تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو جتنے حصے پر امت متفق ہے اتنے پر قناعت کی جائے اور بعض جزوی اختلافات کے کھوج کرید میں نہ پڑا جائے کیونکہ اس سے ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغییر کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس نظریہ پر عمل کر کے صاحب تدبر قرآن نے منکرینِ حدیث کے بہت سے چور دروازے بند کر دیئے ہیں (۲۳)۔

فہم قرآن کی راہ ہموار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن کی تلخیص بھی ایک جید اصلاحی عالم مولانا صدر الدین اصلاحی نے بڑی عرق ریزی، مہارت اور قابلیت کے ساتھ مدتوں کی ریاضت کے نتیجہ میں تیار کی۔ یہ تلخیص جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق مولانا نے مرتب کی جو ۱۹۸۱ء میں طبع ہوئی (۲۴)۔ مولانا اصلاحی کا ایک بڑا کارنامہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو ''تیسیر القرآن'' کے عنوان سے انتیس قسطوں میں ماہنامہ زندگی رامپور میں اگست۔ ستمبر ۱۹۵۰ء سے ستمبر ۱۹۵۳ء تک کے شماروں میں شائع ہوئی۔ افسوس کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا ورنہ قرآن کی ایک اور محققانہ تفسیر مکمل ہو جاتی (۲۵)۔

علوم قرآن کی اشاعت اور قرآن کی روشنی میں علوم دینیہ کی تجدید اور علوم جدیدہ کی تطہیر کے لئے فضلائے اصلاح نے اپریل ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ میں ادارہ علوم القرآن کی بنیاد رکھی جس کے صدر ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی اور سیکریٹری پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی مقرر ہوئے۔ صدر ادارہ کی ادارت میں جولائی ۱۹۸۵ء سے ایک ششماہی رسالہ علوم القرآن کے نام سے نکل رہا ہے۔ یہ رسالہ علوم مباحث قرآنی کا اختصاصی رسالہ ہے۔ (۲۶)۔ اس کا انداز اور علمی معیار اہل علم کے درمیان پسند کیا گیا ہے۔ ''قرآنی نقطہ نظر سے کسی سماجی یا معاشی مسئلہ کا تجزیہ، انسانی زندگی کے کسی پہلو سے متعلق قرآنی تعلیمات کا مطالعہ، بعض مخصوص قرآنی الفاظ کی تحقیق، قدیم وجدید مفسرین میں سے کسی کی خدمات کا تعارفی مطالعہ، مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم اور قرآنی علوم کی منتقلی کا جائزہ، معاصر وغیر معاصر رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ، قرآنیات پر نئی کتابوں کا تعارف اور قرآن وقرآنیات سے متعلق اہم دلچسپ خبریں عام طور پر اس مجلّہ کے مشتملات کا حصہ ہوتی ہیں'' (۲۷)۔

فکر اسلامی کی ترجمانی:

بانیان وفضلائے مدرسۃ الاصلاح کا ایک نمایاں کارنامہ دین اسلام اور فکر اسلامی کی ٹھیٹھ قرآنی ترجمانی اور بغیر کسی معذرت خواہی، مصالحت اور ذہنی مغلوبیت کے بے لاگ مومنانہ تشریح اور جرأت مندانہ تعبیر ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں علماء و مصلحین نے عام طور پر دفاعی انداز، مصالحانہ اسلوب اور معذرت خواہانہ منہج اختیار کیا ہے۔'' سیاسی ومعاشی تسلط اور تہذیبی وذہنی مرعوبیت نے خود مسلمانوں کے درمیان ایسا طبقہ پیدا کر دیا جو اپنے فروتر علمی معیار، غیر تخلیقی ذہانت، کم سوادی اور پست ہمتی کی بنا پر اپنے نظریہ زندگی، قدروں اور علمی وتہذیبی ورثے کے بارے میں احساس کہتری کا شکار ہے۔ اور ہر مسئلہ کو مغربی افکار و تہذیب کے معیار پر تولتا ہے اور جس کے علم وتحقیق اور جدت پسندی کا منتہائے کمال یہ ہوتا ہے کہ رائج الوقت نظریات اور سکنہ بند خیالات کی تائید اسلام کی زبان سے کرادی جائے'' (۲۸)۔
مولانا فراہی نے مغرب کے اس فسوں کو توڑ کر احساس کہتری سے مبرا ہو کر فکر اسلامی کی ترجمانی کی۔ اسلام میں جہاد کے موضوع پر وجود میں آنے والی بیشتر تحریریں دفاعی اور محکومانہ

ذہنیت کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں (۲۹)۔ مگر مولانا فراہی ان تمام مصنفین کو مسترد کر دیتے ہیں جو قرآن کی آیت سیف ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ﴾ (التوبۃ: ۵) کو منسوخ مانتے ہیں یا جہاد کو دفاع کی قسم میں محدود تصور کرتے ہیں اور رسول اکرم ﷺ کے تمام غزوات کو دفاعی جہاد بتاتے ہوئے بعد کے خلفاء وصحابہ کی لڑائیوں کو ملوکانہ قرار دیتے ہیں جن کا جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مولانا فراہی کا موقف یہ ہے کہ قتال صرف دفاع کے لئے واجب نہیں ہوا تھا بلکہ خانۂ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے اور دین اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کے لئے ہوا تھا اور یہ وجوب اپنی شرائط کے ساتھ قیامت تک کے لئے ہے (۳۰)۔

اسی طرح بیشتر مصنفین نے غیر سودی نظامِ معیشت کی تشکیل اور اس کا اجراء ونفاذ تو نہ کیا ہاں ان کی کم ہمتی، پست فکری اور احساس مغلوبیت نے انھیں یہ راہ ضرور سجھادی کہ مختلف تاویلوں سے سود کو جائز قرار دے لیا۔ انھوں نے قرون وسطیٰ کی دلیلیں دہرائیں اور دعویٰ کیا کہ تجارتی اور پیداواری قرضے اور ان پر سود لینے دینے کا طریقہ عرب میں رائج نہ تھا یہ ایک نئی صورت حال ہے۔ اس وقت ذاتی حوائج اور صرفی مقاصد کے لئے قرضے دیئے جاتے تھے اور ان پر زائد رقم کو اسلام نے ربا قرار دیا ہے۔ خوش حال افراد یا تاجروں سے جو زائد رقم وصول کی جائے وہ ربا نہیں انٹرسٹ (Interest) ہے۔ مولانا فراہی نے ہر طرح کے سود کو ''ربا'' قرار دیا اور اسے یکساں طور سے حرام بتایا (۳۱)۔ خود قرآن کریم سے ثابت کیا کہ عربوں میں زیادہ تر سودی کاروبار خوش حال و تاجر پیشہ لوگوں کے ساتھ تھا۔ آیت ربا کی تشریح میں آپ نے تحریر کیا کہ ﴿ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ﴾ (البقرۃ: ۲۸) سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہل عرب خوش حال لوگوں سے سود لیتے تھے پھر قریش تاجر لوگ تھے اور سودی کاروبار ان میں رائج تھا، اس وجہ سے اس معاملہ میں ان کے اور ہمارے حالات کے درمیان کوئی خاص فرق مجھے سود کے بارے میں نظر نہیں آتا واللہ اعلم۔ اسی نکتہ کی مزید وضاحت مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں کی ہے اور عربی زبان کے اس اسلوب پر بڑا مدلل کلام کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''عربی زبان میں ان کا استعمال عام اور عادی حالات کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عموماً نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کیلئے عربی میں ''اذا'' ہے اس روشنی میں غور کیجئے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے

کہ اس زمانہ میں عام طور پر قرضدار ذومیسرۃ (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرض دار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی'' (۳۲)۔ اس لئے یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ عرب میں صرف مہاجنی سود رائج تھا اور غریب و نادار لوگ ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے مہاجنوں سے جو قرض لیتے تھے اس پر انھیں بھاری سود دینا پڑتا تھا اور اسی کو قرآن نے ربا قرار دیا ہے۔ ربا میں ہر طرح کا سود شامل ہے خواہ اس کا تعلق بنیادی ضرورتوں کے لئے قرضے سے ہو یا تجارتی و کاروباری قرضے سے (۳۳)۔

فکر اسلامی کی یہی بے لاگ ترجمانی ہمیں مولانا صدرالدین اصلاحی کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ آپ کی کتب ''اساسِ دین کی تعمیر'' اور ''دین کا قرآنی تصور'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آخرالذکر کتاب مولانا کے معروضی و محققانہ مطالعہ اور دین کی قرآنی تعبیر کی ٹھیٹھ اسلامی ترجمانی کی شاہکار ہے۔ وہ خدا و بندے کے درمیان متصوفانہ تعلق کی نفی کرتے ہیں۔ تصوف کا سارا زور خدا سے عشق و محبت کرنے اور اس سے وصال کی جدوجہد کرنے پر ہے۔ جس میں اصل مقصود خدا کا قرب و وصال اور رجاء یا فناء الفناء قرار پاتا ہے۔ مصنف کا ماحصل یہ ہے کہ خدا اور انسان کے مابین عبودیت کی نسبت ہے نہ کہ عشق کی اور خدا کا تعلق بندے سے رحمت و ربوبیت کا ہے اور انسان جذبۂ شکر کی بنیاد پر خدا سے رشتہ استوار کرتا ہے مگر اس تعلق میں محبت اور وارفتگی ضروری ہے۔ انسان سے اصل مطالبہ یہ ہے کہ وہ اس دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھے اور اس میں تقویٰ کی زندگی گذارے۔ زندگی کے ہنگاموں سے فرار اور رہبانیت کی تعلیم قرآن کے تصور دین کے منافی ہے (۳۴)۔ مصنف کی دوسری تحقیقات ''مسلمان اور امامت کبریٰ''، ''اسلام ایک نظر میں''، معرکۂ اسلام و جاہلیت اور حقیقتِ نفاق وغیرہ میں بھی یہی جرأت مندانہ اور بے لاگ ترجمانی نظر آتی ہے۔

xxxxxxxxxxxxxxxxxx

تعلیقات وحواشی:

(۱) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۶۸۳

(۲) مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح۔ تعلیمی تحریک وفکری پس منظر، ماہنامہ رفیق منزل نئی دہلی کا مسلم تعلیمی تحریکات وشخصیات نمبر، ج: ۱۰، شمارہ ۵۔۶، مئی۔جون، ۱۹۹۷ء، ص ۴۳۔ مضمون نگار نے انجمن اصلاح المسلمین کا سن قیام ۱۹۰۶ء تحریر کیا ہے جبکہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی تحقیق یہ ہے کہ اس کی ابتداء ذوالحجہ ۱۳۲۱ھ میں ہوئی جو مطابق ہے فروری ۱۹۰۴ء کے۔ ذکر فراہی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص ۳۴۸

(۳) روائیداد جلسہ چہارم انجمن اصلاح المسلمین اعظم گڑھ منعقدہ ۲۲۔۲۴ مئی ۱۹۰۸ء، مرتبہ مجلس انتظامیہ انجمن، مطبع ماہتاب واقع شہر اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۰۸ء، ذکر فراہی، حوالہ بالا، ص ۳۴۸

(۴) عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی، خلیل الرحمٰن۔ میرا بھائی، ماہنامہ شاعر بمبئی (خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر) مکتبہ قصر الأدب بمبئی، جلد ۵۱، شمارہ ۴۔ ۱۹۸۰ء، ص ۴۲

(۵) سید سلیمان ندوی، یاد رفتگان، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۸، عام طور پر سوانح نگاروں نے "مدرسہ اصلاح المسلمین" کا اولین بانی مولانا فراہی کو قرار دیا ہے۔ مگر ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی تحقیق کے مطابق پہلے ناظم مولوی محمد شفیع ہی تھے۔ مولانا فراہی اس وقت الٰہ آباد میں تھے اور وہیں سے قائم مقام ناظم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حوالہ بالا، ص ۳۶۴

(۶) تفصیل کے لئے دیکھئے، ذکر فراہی، حوالہ بالا ص ۳۶۴۔۳۶۸

(۷) نفس مصدر، ص ۴۲۴

(۸) سید سلیمان ندوی، یاد رفتگان، حوالہ بالا، ص ۱۴۶۔۱۴۷

(۹) دستور العمل مدرسۃ الاصلاح، حمیدیہ پریس سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۲۔۳

(۱۰) شذرات امین احسن اصلاحی، ماہنامہ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، اگست ۱۹۳۶ء، ص ۷۔۸

(۱۱) یاد رفتگان، حوالہ بالا ص ۱۴۷۔۱۴۹

(۱۲) ذکر فراہی، حوالہ بالا، ص ۳۹۵

(۱۳) دیکھئے مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، حوالہ بالا، ص ۴۴

(۱۴) شذرات مولانا امین احسن اصلاحی، ماہنامہ الاصلاح، اگست ۱۹۳۶ء ص ۳۔۴

(۱۵) ذکر فراہی، حوالہ بالا، ص ۳۹۷۔۴۰۰

(۱۶) نفس مصدر، ص ۴۳۲

(۱۷) نفس مصدر، ص ۳۹۶

(۱۸) یادِ رفتگان، حوالہ بالا، ص ۱۵۱

(۱۹) ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، پیش لفظ قرآنی مقالات (ماہنامہ الاصلاح کے منتخب قرآنی مضامین)، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء ص ۶۔ اس مجموعہ میں مولانا حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا حافظ عبدالأحد اصلاحی، مولانا بدرالدین اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے ۲۵ مضامین شامل ہیں۔ انھیں دیکھ کر الاصلاح کے علمی معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۲۰) مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، حوالہ بالا، ص ۴۵

(۲۱) ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، فراہی سیمینار (اداریہ) ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۶، شمارہ ۱۔۲، جنوری۔ دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۹

(۲۲) انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح کا سالانہ مجلّہ شمارہ ۹، ۱۹۹۶ء (مرحوم اصلاحی شخصیات پر خاص نمبر) اس مجلّہ میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا عزیز الرحمٰن اصلاحی، مولانا عبدالسلام فراہی اصلاحی، مولانا نورالہدیٰ نور اصلاحی، مولانا محمد یونس اصلاحی، مولانا محمد عاصم اصلاحی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا اظہار الدین اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی فراہی اصلاحی، مولانا غالب احسن اصلاحی، مولانا عبدالعلی اصلاحی، انور اعظمی، مولانا عبدالمجید ندوی، مولانا صغیر احمد اصلاحی گونڈوی کی سوانح پر طلبہ کے مختصر مضامین شامل ہیں جو مفید ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں "عربی زبان وادب کے ارتقاء میں مدرسۃ الاصلاح کی خدمات کے موضوع پر عزیزی محمد ارشد نے ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی نگرانی میں ۲۰۰۴ء میں شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس تحقیقی مقالہ کی فراہمی کے لئے راقم نگران تحقیق کا مشکور ہے۔

(۲۳) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، جلد اول، دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۲۹۔۳۰۔ مصنف نے حقیقت توحید، حقیقتِ شرک، حقیقتِ تقویٰ جیسی کتابوں میں یہی خدمت انجام دی ہے۔

(۲۴) مولانا صدرالدین اصلاحی، تلخیص تفہیم القرآن، دہلی، باردوم، ۱۹۸۵ء، تلخیص کا طریقہ کار ملاحظہ کیجئے ص ۳۔۴

(۲۵) تفسیر تیسیر القرآن کی ابتدا دراصل غیر مسلم ذہن کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی۔ بعد میں اسے ہندی زبان میں منتقل کرانے کا منصوبہ تھا تاکہ برادران وطن براہ راست قرآن سے مستفید ہوسکیں۔ چنانچہ ان مقامات پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے جو غیر مسلموں کے پیش نظر اہم ہیں اوران میں دعوتی اسلوب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جیسے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کرتے وقت ﴿ایاك نعبد﴾ میں ''عبادت'' کی مفصل اور جامع تعریف ہے۔ یا سورۃ البقرۃ کا آغاز کرتے وقت ﴿آلم﴾ حروف مقطعات پر کوئی بحث نہیں ہے۔ تاہم تفسیر میں محققانہ طرز بھی کارفرما ہے۔ بعض مقامات پر مصنف نے جملہ مفسرین سے اختلاف کیا ہے اور نادر نکتے بیان کئے ہیں۔ تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، تفسیر تیسیر القرآن ایک مطالعہ، مجلّہ حیات نو بلریا گنج، اعظم گڑھ (مولانا صدرالدین اصلاحی۔ حیات وخدمات) ج ۱۶، شمارہ ۱۔۴، رمضان۔ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ/جنوری۔ اپریل ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۶۔۲۲۲

(۲۶) اشاریہ مرتبہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ ۲۰۰۵ء

(۲۷) ڈاکٹر ظفر الاسلام، ادارہ علوم القرآن۔ ایک جائزہ، ششماہی علوم القرآن علی گڑھ ج ۴، شمارہ ۱، جنوری۔ جون ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۹۔ مختلف اسباب کی بناء پر اس مجلّہ کی اشاعت میں باقاعدگی نہیں آپارہی ہے جیسے معیاری مضامین کی کمیابی، ہمہ وقتی عملہ کی عدم فراہمی، کتابت اور کمپوزنگ کی دشواری جس کا شکوہ خود منتظمین ادارہ ومجلّہ کو ہے۔ دیکھئے نفس مصدر، ص ۱۱۰۔۱۱۱

(۲۸) ڈاکٹر فضل الرحمٰن (گنوری) تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے، علی گڑھ مسلم یونیوسٹی ۱۹۶۷ء پیش لفظ ص الف تاح

(۲۹) مسئلہ جہاد کی مرعوبانہ تشریح کے لئے دیکھئے مولانا محمد حسین بٹالوی (۱۲۵۶۔۱۳۳۸ھ) کا رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجهاد۔ یا سرسید احمد خان کی تفسیر القرآن لاہور، جلد اول، ص ۲۵۳۔۲۵۴

(۳۰) تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا حمید الدین فراہی، تفسیر نظام القرآن، اردو ترجمہ امین احسن اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء، ص ۵۶۔۵۸، مولانا فراہی کے اس کارنامہ پر مفصل بحث کے لئے دیکھئے راقم کا مضمون در ششماہی علوم القرآن

۶/۱-۲، جنوری- دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۹۷-۱۰۸

(۳۱) حمید الدین فراہی، مخطوطہ حواشی قرآن کریم سورہ بقرۃ: ۲۸۰

(۳۲) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، حوالہ بالا ج ۱ ص ۶۳۹

(۳۳) ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، قرآنی معیشت کے بعض بنیادی مسائل، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۶، شمارہ ۱-۲، جنوری- دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۹-۱۲۳

(۳۴) مولانا صدر الدین اصلاحی کی فکری خدمات کے لئے دیکھئے، غطریف شہباز فلاحی ندوی، برصغیر میں فکر اسلامی کے ارتقاء میں مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کا حصہ، ماہنامہ مجلہ حیات نو، بلریا گنج (مولانا صدر الدین اصلاحی- حیات و خدمات)، نفس مصدر، ص ۲۸۵-۲۹۴

xxxxxxxxxxxxxxxxxxx

جامعۃ الفلاح

اخلاص و وفا کی خوشبو:

جامعۃ الفلاح (۱) بلریا گنج اعظم گڑھ کی شہرت و مقبولیت اور قومی و ملکی افادیت کے سنہری دور کا آغاز بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے اوائل سے ہوا جبکہ وہاں کی مجلس انتظامیہ نے ۱۷ ردسمبر ۱۹۶۲ء کو جناب محمد اکرام خاں پردھان کی صدارت میں مولانا ابوبکر اصلاحی کی تجویز کے مطابق اس ادارہ کا نام جامعۃ الفلاح رکھا۔ اور عربی درجات کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۳ء سے درجہ ہشتم عربی اول کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد یہ ادارہ رفتہ رفتہ ترقی و استحکام کے تمام مراحل طے کرتا ہوا ہندوستان کی قابل اعتماد تربیت گاہ اور علوم اسلامیہ و عصریہ کی ممتاز جامعہ میں تبدیل ہو گیا۔

اس ادارہ کی تخم ریزی ۱۹۱۴ء میں بلریا گنج قصبہ کے ایک مخلص مسلمان علی احمد خان مرحوم کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ان کے بھائی منشی لعل محمد خان مرحوم اس ادارہ کے پہلے استاذ تھے۔ اور اس کا نام ''مکتبہ اسلامیہ'' تھا۔ آغاز میں ولی محمد خان مرحوم کے گھر میں بچوں کی تدریس ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں مٹی کی دیوار اور کھپریل سے تعمیر کردہ مدرسہ کی نئی عمارت میں تعلیم منتقل ہوگئی۔ یہ ابتدائی تعلیم علی احمد خان منیجر مکتب کی سرپرستی میں ۱۹۲۷ء تک جاری رہی پھر ان کے بیٹے محمد حنیف خان مرحوم نے مکتب کی ذمہ داری قبول کی اور ۱۹۵۴ء تک منیجر کی حیثیت میں سارے مصارف اور انتظام و انصرام کی نگہداشت کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں یہ مکتب ''مدرسہ اسلامیہ'' کے نام سے موسوم ہوا اور تیسری جماعت سے پانچویں جماعت تک تعلیم کا بندوبست بھی ہو گیا۔ ابتک مکتب کو سرکاری امداد ملتی تھی اسی سال فیصلہ ہوا کہ سرکاری معاونت سے دست کش ہو جانا بہتر ہے چنانچہ یہ سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ اس دور کے اساتذہ میں مولوی محمد ادریس کافی مقبول ہوئے جنھوں نے ۱۹۳۲ء سے تدریس کا آغاز کیا اور ۱۹۹۹ء تک اس ادارہ سے وابستہ رہے۔ دوسرے استاذ منشی محبوب علی تھے جنھوں نے ۱۹۲۸ء ہی سے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

جامعہ اسلامیہ کا پیراہن:

۱۹۵۹ء میں مدرسہ اسلامیہ نئے نام جامعہ اسلامیہ کے پیراہن میں آ گیا۔ اسی سال درجہ ششم کی جماعت شروع ہوگئی، مولانا محمد عیسیٰ قاسمی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر ادارہ میں تشریف لائے اور عربی زبان کی تدریس بھی ششم ہی سے شروع کردی گئی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۹۵۶ء ہی سے ڈاکٹر خلیل احمد کی کوششوں سے عربی زبان کی تعلیم کا آغاز ہوگیا تھا (۲)۔ اس مرحلہ میں جو درسی کتب داخل نصاب کی گئیں وہ جماعت اسلامی ہند کی تیار کردہ تھیں۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر خلیل احمد کی کوششوں سے دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش سے مدرسہ کا الحاق ہوگیا۔

۵ر مئی ۱۹۶۱ء کو مجلس جامعہ اسلامیہ نے ایک مجلس تعلیمی تشکیل دی جس کے اراکین میں ڈاکٹر وکیل احمد اور حاجی عبدالمتین خان جیسے مخلص اور سربرآوردہ لوگ شامل تھے۔ ۳ر جولائی ۱۹۶۱ء کی نشست میں مجلس تعلیمی نے فیصلہ کیا کہ جامعہ حکومت کی مالی امداد اور سرپرستی سے آزاد رہے گا تاکہ تعلیم وتربیت کے منصوبوں میں حکومت کی مداخلت نہ ہو سکے۔ اس سال ہفتم کا درجہ بھی شروع ہوگیا۔ مجلس تعلیمی نے دس سال کی عمر کے بعد طالبات کی علیحدہ تعلیم کا بندوبست کرنے کی منظوری دی۔

۶۲۔۱۹۶۱ء کا تعلیمی سال اس ادارہ کے لئے بڑا تاریخ ساز ثابت ہوا۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ سے چند نامور اساتذہ جماعت اسلامی ہند سے باضابطہ تعلق قائم کرنے کے جرم میں ملازمت سے سبکدوش کردیئے گئے۔ ان کے بارے میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ یہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بجائے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی کی فکر سے متاثر اور اس کے مبلغ ہیں (۳)۔ مجلس انتظامیہ کے اس ناعاقبت اندیشی پر مبنی فیصلہ سے ایک اہم خیر، یہ برآمد ہوا کہ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کے اجلاس منعقدہ ۱۸۔۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء نئی دہلی میں مولانا نظام الدین اصلاحی کی تجویز پر اعظم گڑھ ضلع میں ایک اعلیٰ دینی تعلیمی ادارہ کی تاسیس پر غور ہوا اور ۱۴۔۱۸ دسمبر ۱۹۶۱ء کے اگلے اجلاس کی شوریٰ میں ایک عربی دارالعلوم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اور مولانا ملک حبیب اللہ امیر حلقہ مغربی یوپی کے سر پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ اس اسکیم کی باقاعدہ تحقیق کریں (۴)۔ اور اس کے نفاذ کا جائزہ لیں۔ جماعت اسلامی اعظم گڑھ کے شورائی فیصلہ کے نتیجہ میں شہر اعظم گڑھ میں ۲۳ر شوال

۱۳۸۱ھ/۳۰/مارچ ۱۹۶۲ء کو مولانا مجیب اللہ ندوی کی نظامت میں جامعۃ الرشاد کے نام سے ایک نئے تعلیمی ادارہ کا آغاز ہوگیا۔ اسی سال جامعہ اسلامیہ بلریا گنج کو چھوڑ کر مولانا عبد الحسیب اصلاحی نے پہلے سے کئے ہوئے وعدہ کی بنا پر جامعۃ الرشاد کی ملازمت قبول کرلی۔ یہاں ان کی جگہ مولانا شبیر احمد اصلاحی کا تقرر ہوا جو پہلے پورنیہ بہار کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے۔

مولانا شبیر احمد اصلاحی نے پورے جوش وخروش اور مبلغانہ جذبہ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ میں تدریس شروع کردی۔ انھوں نے نصاب تعلیم کو مزید منضبط کیا اور درسی کتب کے انتخاب میں دیدہ ریزی، مہارت اور ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا۔ اطراف وجوانب کے مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے لئے جمعہ کے خطبے دیئے اور پورے علاقہ کی رگوں میں خون زندگی دوڑادی۔ وہ ۲۵/دسمبر ۱۹۶۲ء کو صدر مدرس منتخب کر لئے گئے۔

جامعۃ الفلاح کی صورت گری:

۱۹۶۲ء ہی میں جامعہ اسلامیہ کو نیا نام دینے کی تجویز زیر غور آئی تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو کوئی مخصوص ومنفرد انتساب حاصل ہوسکے۔ ناظم جامعہ اسلامیہ ڈاکٹر خلیل احمد نے اپنی خواہش کا اظہار متعدد اہل علم احباب سے کیا۔ مولانا ابوبکر اصلاحی، مفتی عبد الرؤف مبارکپوری، مولانا شبیر احمد اصلاحی، مولانا ملک حبیب اللہ قاسمی سب نئے نام کے انتخاب کے لئے پریشاں اور سرگرداں تھے۔ ایک دن قصبہ کی سڑک پر واقع مسجد میں نماز عصر کی ادائیگی کے بعد لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے کسی بزرگ نے ﴿قد أفلح المؤمنون﴾ قرآنی آیت کی تلاوت کی اور فوری طور پر جامعۃ الفلاح کا نام ذہن میں آیا دوسرے بزرگوں نے تائید کی اور مجلس انتظامیہ نے ۱۷/دسمبر ۱۹۶۲ء کے اجلاس میں اس نام کو باقاعدہ منظوری عطا کی (۵)۔

۱۹۶۴ء میں عالمیت اول کے طلبہ نے کامیابی حاصل کی اور عالمیت دوم میں داخل ہوگئے۔ مدرسۃ الاصلاح سے برطرف کردہ اساتذہ کرام یہاں تشریف لائے تو ان کے ساتھ طلبہ کی ایک معقول تعداد بھی کشاں کشاں چلی آئی اور عالمیت سوم وچہارم کے درجات بھی اسی سال تشکیل پاگئے۔ ۱۹۶۷ء میں فضیلت کی تعلیم مکمل کرکے فارغ التحصیل طلبہ کی پہلی جماعت "فلاحی" بن کر نکلی۔ اس طرح عربی درجات کی اعلیٰ تعلیم کا نظم ہوگیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبد الحسیب اصلاحی جامعۃ الرشاد کو چھوڑ کر یہاں تشریف لائے تو عالمیت چہارم کے طلبہ ان

کی معیت میں یہاں داخل ہوئے اور جب مولانا جلیل احسن ندویؒ پہلی بار استاذ کی حیثیت سے یہاں رونق افروز ہوئے تو فضیلت اول و دوم کے طلبہ انھیں کی لیاقت و کردار کی کشش محسوس کر کے ان کے ساتھ یہاں داخل ہوئے۔

کلیۃ البنات کی تاسیس:

لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ارباب جامعہ آغاز کار سے متفکر اور پریشان تھے۔ ۲۸؍مئی ۱۹۶۱ء کی مجلس انتظامیہ کی نشست میں طالبات کی اعلیٰ دینی تعلیم کی تجویز زیر غور آئی لیکن کلیۃ البنات کی تاسیس کا فیصلہ ۲۱؍نومبر ۱۹۶۵ء کے اجلاسِ مجلس انتظامیہ میں ہوسکا۔ اس مقصد کے لئے قصبہ کی مغربی مسجد سے قریب ایک رہائشی مکان خریدا گیا اور ۱۹۶۶ء میں طالبات کے لئے درجہ پنجم کا آغاز ہوگیا۔ ۱۹۶۹ء میں ہفتم تک کے درجات قائم ہوگئے۔ ۱۹۷۸۔۱۹۸۳ء کے عرصہ میں عالمیت کے درجات زینہ بزینہ ترقی کرتے گئے آخر کار ۱۹۸۴ء میں فلاحی طالبات کا پہلا گروپ فضیلت کی تکمیل کر کے فارغ ہوا۔ اس وقت کلیۃ البنات میں طالبات کی ازابتدائی تا تکمیل تعلیم کا علیحدہ نظم ہے جس کی کل مدت سولہ سال ہے۔ کلیۃ البنات اور دوسرے ملحق اداروں میں خواتین اساتذہ کی شدید ضرورت کے پیش نظر تخصص فی التدریس کا ایک سالہ نصاب مجلس تعلیمی کے اجلاس ۲۳۔۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء میں زیر غور آیا اور کئی سالوں کے مسلسل غور و بحث اور ماہرین کے تجربات سے استفادہ کے بعد ۲۸؍مئی ۲۰۰۱ء کو منظور ہوا۔ یہ نصاب فضیلت کی تکمیل کے بعد ممتاز اور باصلاحیت طالبات کے لئے مخصوص تھا۔

باصلاحیت اور ممتاز طلبہ کے لئے دوسالہ تخصص فی القرآن ۱۹۷۸ء۔۱۹۷۹ء کے تعلیمی سال میں نافذ ہوا۔ مولانا حافظ احسان الحق فلاحی اور راقم سطور نے اس نصاب کی تکمیل کے بعد ''اسالیب القرآن'' پر اپنا تحقیقی مقالہ بھی جمع کیا۔ اس نصاب کی تجویز ۳؍جنوری ۱۹۷۱ء کی مجلس انتظامیہ میں پہلی بار منظور ہوئی اور پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ جس کے اراکین میں ماسٹر عبدالحکیم ایم اے بی ایڈ، مولانا شہباز احمد اصلاحی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور ڈاکٹر ابرار اعظمی شامل تھے۔ ۱۲؍اگست ۱۹۷۲ء کی نشست میں مجلس انتظامیہ نے تخصص کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا اور مولانا صدرالدین اصلاحی اور مولانا سید حامد علی کو نصاب کی تیاری کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ اس طرح کافی غور و خوض کے بعد یہ نصاب شروع ہوا۔

حفظ و تجوید قرآن کا نصاب ۱۹۷۰ء ہی سے نافذ العمل ہے۔ اب ۲۰۰۳ء سے طالبات کے لئے کلیۃ البنات میں بھی اس کا باقاعدہ نظم ہوگیا ہے۔ اسی طرح دعوت وافتاء کے میدان میں بھی جامعہ نے دلچسپی لی۔ ۱۹۵۹ء میں اس کا نظم قائم ہوا اور مفتی عبدالرؤف مبارک پوری اس ذمہ داری کو مدتوں انجام دیتے رہے۔ ان کے بعد مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا صغیر احسن اصلاحی نے یہ ذمہ داری نبھائی۔ اب مولانا طاہر مدنی اس خدمت میں مصروف ہیں۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۴ء کے اجلاس مجلس انتظامیہ میں اس شعبہ کو مزید متحرک بنانے کا فیصلہ ہوا اور اس سمت میں متعدد اقدامات کیے گئے۔

ادارہ علمیہ کا قیام:

اسلامی درسیات کی تیاری اور طلبہ و نوجوانوں کو معاصر مشکلات اور مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ و مستعد بنانے کی خاطر صالح ادبیات کی فراہمی کے لئے مجلس انتظامیہ نے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے اجلاس میں ''ادارہ علمیہ'' کے قیام کا فیصلہ کیا۔ ادارہ نے اردو، ہندی اور عربی میں جامعہ کے اساتذہ اور مخلصین جامعہ کی تیار کردہ کتب شائع کیں۔ اسی طرح مدارس اور علماء کے فرائض منصبی پر کئی تحقیقی کتابیں اس ادارہ سے طبع ہوئی ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں جامعہ کی مجلس شوریٰ نے ادارہ کی ایک مشاورتی کونسل تشکیل دی۔ مولانا سید جلال الدین عمری اس کے مدیر اور مولانا مقبول احمد فلاحی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس وقت کئی مسودے ادارہ کی تحویل میں ہیں اور طباعت کے لئے زیر غور ہیں۔ جن میں چند حال ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہو گئے ہیں۔

مقاصد جامعہ:

۲۹ر جون ۱۹۶۴ء کے اجلاس انتظامیہ میں جامعۃ الفلاح کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد طے کیے گئے:

(۱) ایسے افراد تیار کرنا

(ا) جو قرآن و سنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

(ب) جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار و نظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

(ج) جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔

(د) جن میں احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ ہو۔

(ہ) جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۲) ایسا نصاب تعلیم زیر عمل لانا جس میں دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین امتزاج ہو اور جو جامعہ کی اساس سے ہم آہنگ ہو (۶)۔

(۳) اسلام کی خدمت کے لئے دور جدید کے تقاضوں کے مطابق فکری، عملی اور تحقیقی مواد فراہم کرنا۔

(۴) فنی، تکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم کا اس طرح نظم کرنا کہ جامعہ کا بنیادی مقصد متاثر نہ ہو (۷)۔

اغراض و مقاصد کی یہ مفصل تشریح دراصل اس جامع مقصد ہی کی تفسیر ہے جو ۳ر جولائی ۱۹۶۱ء کو جامعہ اسلامیہ کی مجلس تعلیمی نے قصبہ کی مغربی مسجد میں طے کیا تھا۔ اسوقت بھی نصاب تعلیم میں صرف انہی کتابوں کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جن کو پڑھ کر بچے اسلام کا صحیح فہم حاصل کر سکیں (۸)۔

ملت اسلامیہ کی بقا اور ترقی کیلئے نئی نسل کی تعلیم و تربیت ایک بنیادی اور اہم ضرورت ہے۔ اس کا شعور و احساس دردمندانِ ملت کو ہر دور میں رہا ہے۔ حالات و وسائل کے اعتبار سے اس بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے اور ملت کو اس کے ثمرات بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن نامساعد حالات اور اغیار کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خواہش اور تمنا کے باوجود ملت کے دینی مدارس و مکاتیب میں وہ نصابِ تعلیم و تربیت رائج نہ ہو سکا جو نئی نسل کو قرآن و سنت کا گہرا اور وسیع علم دے۔ ان میں صحیح دینی بصیرت اور داعیانہ اوصاف پیدا کرے اور ساتھ ہی عصری علوم سے ان کو آراستہ کرے تاکہ وہ باطل افکار و نظریات کے مقابلہ میں اسلام کا دفاع کر سکیں اور اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی انسانیت کے سامنے دلائل کے ساتھ پیش کر سکیں۔

حرکیت اور قائدانہ فکر:

بیسویں صدی میں تحریکات اسلامی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اسلامی بیداری کی لہر نے اس بات کی شدید ضرورت پیدا کی کہ قرآن و سنت کی بنیاد پر از سر نو ایک جامع، مناسب،

متحرک اور موثر نظام تعلیم وتربیت ترتیب دیا جائے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک طرف اگر طلبہ میں علوم دینیہ کی ماہرانہ صلاحیت پیدا کرے تو دوسری طرف عصری علوم سے بھی انھیں بہرہ ور کرے۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت جامعۃ الفلاح کا قیام عمل میں آیا (۹)۔ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ میں مولانا محمد عیسیٰ قاسمی کے دور نظامت میں ایک دوسرے اسلوب میں قیام جامعہ کی غرض وغایت واضح کی گئی: ''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور دنیا وآخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا ضامن ہے لیکن امت مسلمہ میں ہمہ جہتی بگاڑ کی وجہ سے اسلام کے فیوض و برکات جو ظاہر ہونا تھے، ظاہر نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں اصلاح کی پوری کوشش صرف کی جائے اور مختلف جہت سے اسلام کی صداقت ثابت کی جائے اور دنیا کے سامنے اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ جامعۃ الفلاح کے قیام کی اصل غرض وغایت یہی ہے'' (۱۰)۔

ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے جامعۃ الفلاح نے جو نصاب تعلیم اختیار کیا ہے وہ قدیم وجدید مضامین کا بہترین آمیزہ ہے۔ عالمیت کے پانچ سالہ اور فضیلت کے سہ سالہ نصاب میں قرآن کریم، اصول تفسیر، حدیث واصول حدیث، فقہ اسلامی، عربی ادب وانشاء، قواعد صرف و نحو، عقیدہ اسلامی، تاریخ وجغرافیہ اسلام، علم فرائض اور اسرارِ شریعت کے ساتھ انٹرمیڈیٹ اور بی اے (بالترتیب) کی سطح تک انگریزی، علم تمدن، علم سیاسیات، علم معاشیات اور فن تدریس کے مضامین شامل ہیں۔ کتابیں بھی N.C.E.R.T کی طبع کردہ ہیں اور معیار بھی تقریباً وہی ہے۔ نصاب کی اسی خصوصیت کی بنا پر یہاں کی عالمیت کی سند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، پروانچل یونیورسٹی جون پور میں انٹرمیڈیٹ کے مساوی تسلیم کی جاتی ہے اور یہاں کے طلبہ آرٹس اور سوشل سائنس کے تمام مضامین میں بی اے میں داخلہ لینے کے مجاز ہیں۔ فضیلت کی سند بی اے کے مساوی تسلیم کی جاتی ہے اور فارغ التحصیل طلبہ ایم اے میں عربی ودینیات اور اسلامک اسٹڈیز کے مضامین میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

نصاب تعلیم کا ایک امتیاز قرآن اور علوم قرآن کو مرکزی مقام دینا ہے۔ تفسیر قرآن کے باب میں منتخب سورتوں کی تفسیر پڑھائی جاتی ہے مگر کوئی ایک تفسیری کتاب خصوصی طور سے شامل نصاب نہیں ہے۔ طلبہ تمام مشہور تفاسیر کا مطالعہ کرتے ہیں استاذِ تفسیر جماعت میں محاضرہ دیتے

ہیں مشکل الفاظ ولغات کو حل کراتے ہیں مشکل آیات کو نظم و مناسبت کی روشنی میں حل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔اس طرح تفکر و تدبر کی یہ دعوت طلبہ کو براہ راست قرآن تک لے جاتی ہے اور ان کا رابطہ کلام الٰہی سے بغیر کسی واسطہ کے ہوتا ہے۔اس سے علوم و معارف قرآنی میں غواصی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ یہاں فکر فراہی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے مگر اس کی بندش دوسرے مفسرین کے افکار سے آزادانہ استفادہ کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم فقہی حد بندیوں سے بالاتر ہوکر دی جاتی ہے۔فقہائے اربعہ کے افکار ونظریات کا مطالعہ نصاب میں شامل ہے علامہ ابن رشد کی مایہ ناز کتاب "بدایة المجتهد" نے فقہی توسّع پیدا کرنے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔تمام مسلکوں کے طلبہ اور اساتذہ یہاں موجود ہیں اور یہاں دورانِ درس اور ہم نصابی سرگرمیوں میں کبھی فقہی مسالک زیر بحث نہیں آتے اس کی ایک خاص وجہ یہاں کے طلبہ واساتذہ کی بھاری اکثریت کا تحریک اسلامی ہند سے رسمی یا غیر رسمی طور پر منسلک ہونا ہے۔اسلامی تحریکات فقہی و مسلکی تنگ نائیوں سے اوپر ہوکر اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ان کے سامنے ملت واحدہ کا تصور ہر آن موجود رہتا ہے۔جامعہ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے جزئی وفروعی مسائل کو کبھی اہمیت نہ دی۔یہاں تک کہ چند سال پہلے سزائے رجم اور اس کے انکار کا ایک علمی معرکہ جامعہ کی چہار دیواری میں واقع ہوا دونوں طرف سے ضخیم کتابیں شائع ہوئیں مگر جامعہ نے اجماع امت پر عمل کیا اور اس معرکہ آرائی سے خود کو دور رکھا۔

دین کے اصول ومبادی اور کلیات کی تعلیم و تدریس جامعہ کا ایک امتیاز ہے۔علوم دین میں گہرائی، تفقہ اور تبحر اس کے طلبہ اور اساتذ کی شان ہے۔اسی لئے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعہ الازہر مصر، جامعہ امام محمد بن سعود ریاض، جامعة الملک سعود ریاض، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ اور وزارة المعارف سعودی عرب نے جامعہ کی اسناد کو تسلیم کیا ہے۔

ملت واحدہ کا تصور:

جامعة الفلاح نے ملت کو "ملت واحدہ" بنانے کی غرض سے تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء اور دانشوروں کو اپنے یہاں مدعو کرکے ان کے افکار و خیالات اور تجربات سے استفادہ کیا ہے۔سیمناروں، علمی مذاکروں، توسیعی محاضرات اور جلسہ گاہوں میں اکابرین علم و تدریس بلا

اختلاف مسلک و مکتب تشریف لاتے رہے ہیں اور خوشگوار علمی ماحول میں سنجیدگی اور متانت سے افہام و تفہیم کرتے رہے ہیں۔ اہل حدیث علماء میں سے ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، مولانا مختار احمد ندوی، ڈاکٹر عبدالعلی ازہری، ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری، مولانا عبدالوہاب خلجی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری وغیرہ، علمائے دیوبند کی فہرست سے مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا برہان الدین سنبھلی، ڈاکٹر تقی الدین مظاہری، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، قاری ابوالحسن اعظمی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی وغیرہ، ندوۃ العلماء سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد رابع ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا مجیب اللہ ندوی وغیرہ اکابرین بارہا جامعہ کو رونق بخش چکے ہیں۔ سنّی علماء میں سے مولانا عبیداللہ خاں اعظمی، ڈاکٹر غلام یحیی انجم بھی ہر طرح سے جامعہ کا تعاون کرتے رہے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد نئی دہلی اور دوسری دانش گاہوں کے فاضل اساتذہ اور اربابِ انتظام و اقتدار نہ صرف علمی و تحقیقی تعاون کر رہے ہیں بلکہ وہاں کی مجلس شوریٰ، مجلس تعلیمی، مجلس امتحانات اور مجلس معائنہ کی باقاعدہ رکنیت بھی اختیار کر چکے ہیں۔ جامعۃ الفلاح نے کھلے دل سے ان تمام علماء و دانش وروں کو مرحبا کہہ کر یہ فکر تشکیل کی ہے کہ ملت ایک ہے۔ اس کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے، اسے فقہی و جماعتی حد بندیوں میں محصور نہیں کیا جاسکتا۔ پوری ملت کو تعمیر معاشرہ اور احیائے دین کی مہم میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔

نصاب کو مطابقِ حال بنانے کی مہم:

مدارس کے نظام و نصاب تعلیم پر تمام جہتوں سے غور و فکر کرتے رہنا اور اسے زیادہ مؤثر، نفع آور، موزوں و مناسب حال بنانے کی منظم جدو جہد کرنا بھی جامعۃ الفلاح کے حسنات میں شامل ہے۔ فروری ۱۹۸۸ء میں ''دینی مدارس اور ان کے مسائل'' پر دو روزہ سیمینار یہاں منعقد ہوا۔ ۲۹۔۳۰/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ''ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس'' کے موضوع پر علمی مذاکرہ ہوا۔ ۲۸۔۲۹/اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ''عصر حاضر اور علوم اسلامیہ'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے علمی مباحثہ میں تمام علماء اور دانش وروں نے علم دین کی معاصر افادیت و موزونیت پر اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے۔ ۲۴/اگست ۲۰۰۳ء کو دہلی میں ''مدارس اسلامیہ، خدمات اور چیلنجز'' کے موضوع پر کنونشن میں مدارس کی خدمات اور ان کی قدر و منزلت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔

۶۔۷/اگست ۲۰۰۴ء کو "مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے" کے عنوان سے ایک مؤثر کارگاہ منعقد ہوئی اور مدارس کے نصاب کے لئے مفید تجاویز کافی بحث ومباحثہ کے بعد ارباب مدارس کے غور وفکر کے لئے منظور ہوئیں۔ ۲۵۔ ۲۷/فروری ۲۰۰۵ء کا عالمی علمی مذاکرہ "دعوت اسلامی اور مدارس دینیہ" کے موضوع پر اس سیاق میں سنگ میل ثابت ہوا اور ہندوستان کے ارباب مدارس کو دعوت دین کے میدان میں ہونے والی جدوجہد کا جائزہ لینے اور اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کا تدارک کرنے کی دعوت دی گئی۔ مدارس دینیہ کے مؤثر کردار کے بارے میں جامعۃ الفلاح کی کوشش یہ رہی ہے کہ یہ ادارے موجودہ دنیا سے مربوط ہوں، ان کے طلبہ کے لئے عصر حاضر کے علوم وفنون تک رسائی حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوں، وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی دعوت اور اصلاح معاشرہ کا فریضہ انجام دے سکیں۔ عصری اداروں میں مزید تعلیم کے مواقع ان کے لئے فراہم ہوں اور تعلیم کی ثنویت کو ختم کر کے ملت میں موجود دونوں تعلیمی دھاروں کے فیض یافتہ حضرات کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے (۱۱)۔

اسلامی دانشوری:

جامعۃ الفلاح کی اصل خدمت فکر اسلامی کی اشاعت اور اس کی توسیع واستحکام ہے۔ یہاں تقلید جامد اور شخصیت پرستی سے بیزاری ہے۔ آزادی فکر قرآن وسنت کے دائرہ میں دانشوری اور اجتہاد علم اس ادارہ کی سوغات ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے عقیدت ومحبت اور ان کے افکار ونظریات سے مؤثر استفادہ کرنے کے باوجود جامعہ کی فکر ان جہانوں میں محدود ومحصور نہیں ہے۔ وہ قرآن وسنت سے براہ راست فیض یابی پر زور دیتی ہے اور کسی بھی مفکر ومجدد اور مصلح کو معصوم نہیں سمجھتی۔ مولانا محمد طاہر مدنی کی کنوینرشپ میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے مولانا مودودی کی مایہ ناز کتاب "خلافت وملوکیت" پر تنقید کرتے ہوئے دو طویل توسیعی محاضرے پیش کئے طلبہ نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ صدر مجلس مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی نے اپنی صدارتی تقریر میں بڑے علمی انداز میں اختلاف رائے کیا اور محاضرہ کا محاکمہ کیا۔ چند ہی سالوں کے بعد پروفیسر موصوف کو جامعہ کی مجلس تعلیمی کا باقاعدہ رکن منتخب کیا گیا اور تب سے ان کے افکار وتجربات سے استفادہ جاری ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ جماعت اسلامی ہند کے سلسلہ میں بعض تحفظات رکھتے ہیں تاہم مجلس

شوریٰ کے ایک معزز رکن کی حیثیت میں جامعہ نے ان کے تجربات اور گراں قدر مشوروں سے استفادہ کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہے۔ مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی فکر فراہی کے پرجوش مبلغ ہیں اور اپنے بعض اجتہادی افکار ونظریات کی وجہ سے کسی قدر مختلف فیہ بھی (۱۲)۔ مگر وہ برسوں جامعہ میں مقبول اور ہر دلعزیز استاذ کی حیثیت سے مدرس رہے اور ۲۲/جولائی ۱۹۹۵ء سے ۲۶/دسمبر ۱۹۹۶ء تک صدر مدرس بھی (۱۳)۔ کیونکہ جامعہ کا نصب العین فکر اسلامی کی اشاعت ہے کسی مخصوص شخصیت، مکتبِ فکر، یا فقہی مسلک کی اشاعت نہیں۔ فلاحی فضلاء کی بڑی تعداد جماعت اسلامی ہند اور اس کے اداروں سے وابستہ ہوکر دین کی خدمت میں مصروف ہے۔ دوسری جماعتوں، تعلیمی اداروں، مکاتبِ فکر اور تصنیفی وتحقیقی معاہد سے جو فلاحی علماء ودانش ور منسلک ہیں انھوں نے جامعۃ الفلاح کے مقصد ونصب العین کو پیش نظر رکھا ہے اور عام طور پر اسی فکر اور منہاج کی نمائندگی کی ہے۔

ہندوستان میں دینی تعلیم کے ادارے عام طور پر انہی مکاتب فکر سے وابستہ اور انہی کے منہج کے علم بردار ہیں۔ دیوبند، ندوہ، بریلی، اہل حدیث، فکر فراہی اور جامعۃ الفلاح کی فکر تحریک اسلامی کے منتسبین ومخلصین اور فیض یافتگان وعلم برداران اس ملک میں دین اسلام، اردو زبان، عربی زبان وادب، شعائر اسلامی کے تحفظ، اسلامی تشخص کے دفاع اور تطہیر معاشرہ وتعمیر ملک وقوم کے لئے کمربستہ ہیں اپنے اپنے منہج اور نصاب تعلیم کے ساتھ جہالت وجاہلیت کے اندھیروں کو مٹانے اور علم وادب کی روشنی عام کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر ان میں اتحاد ویگانگت پیدا ہوجائے اور ان مدارس کا کوئی وفاق وجود میں آجائے (۱۴) تو دعوت اسلامی کے فروغ اور احیائے دین کی مہم میں یہ نہایت مؤثر کردار ادا کرسکیں گے۔

تیز ترمی گامزن، منزلِ مادور نیست

xxxxxxxxxxxxxxxxxx

تعلیقات وحواشی:

(۱) بلریا گنج صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پرگنہ وتحصیل سگڑی میں ایک قصبہ ہے جو شہر اعظم گڑھ سے ۱۷ کلو میٹر کی مسافت پر شمال میں واقع ہے۔ جین پور سے مہراج گنج اور اعظم گڑھ سے رونا پار جانے والی سڑکیں اس قصبہ میں آ کر مل جاتی ہیں۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس آبادی میں دو ہزار سولہ افراد رہائش پذیر تھے۔ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری رپورٹ گیارہ ہزار آٹھ سو اکیانوے انسانوں کی تعداد بتاتی ہے۔ بلریا گنج کی تاریخ میں افسانوی رنگ کی بڑی آمیزش رہی ہے۔ مشہور ہے کہ اکبر اعظم کے دور حکومت میں مینا نگر میں ایک طاقتور چھتری حکمراں تھا اس کے چھوٹے بھائی نے اسلام قبول کرلیا اور گھر سے نکال دیا گیا۔ بڑے بھائی نے حکومت اور جائیداد میں بھی اسے وارث بنانے سے منع کر دیا تب چھوٹا بھائی گمبھیر سنگھ مغل دارالسلطنت آگرہ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں فریاد لے کر پہونچا۔ اس کی شنوائی ہوئی۔ شہنشاہ نے اپنے ایک گورنر کو ریاست کی فوج کے ساتھ یلغار کرنے کا حکم دیا۔ شاہی فرمان کے بموجب دو فیلڈ مارشل اپنی دو ہزار سپاہ لے کر مینا نگر کے شمال میں برسر پیکار ہوئے۔ یہ دونوں کمانڈر خیر الدین خان اور محی الدین خاں سگے بھائی تھے۔ انھوں نے چھتری حکمراں کو شکست دی اور گمبھیر سنگھ کو اس کا حق دلا دیا۔ راجہ گمبھیر سنگھ نے بعد میں ان دونوں کو اپنی فوج میں شامل کرلیا۔ تنخواہ کے علاوہ ان میں سے ہر بھائی کو بارہ گاؤں کی جاگیر بھی عطا کی۔ ان دونوں نے اپنی مرضی سے رہائشی علاقہ کا انتخاب کیا اور خیر الدین پور اور محی الدین پور دو نئے گاؤں بسائے۔ کچھ سالوں کے بعد آس پاس کے دو گاؤں نینی جور اور بھگت پور میں تصادم ہو گیا۔ بھگت پور کے چھتریوں نے خیر الدین پور کے باشندوں سے اعانت طلب کی۔ تین چار پٹھان برادران نے اس پر لبیک کہا مگر اس شرط کے ساتھ کہ فتح کی صورت میں خیر الدین پور کے پٹھانوں کو زمین کا حصہ بطور انعام ملے گا۔ جب بھگت پور نے میدان مار لیا تو پٹھانوں کے ساتھ بدعہدی کی۔ غصہ میں آ کر انھوں نے بزور ان زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ اس علاقہ کا نام اس طرح "بَرریا گنج" پڑ گیا۔ مقامی بھوجپوری زبان میں اس کا مطلب ہے "زبردستی قبضہ کیا ہوا علاقہ" معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام گردش زمانہ سے تبدیل ہو کر "بلریا گنج" ہو گیا۔ دیکھئے حوالہ:

District Gazetters of the onited provinces of Agra and Oudh, Vol.33 (Azamgarh) 1911,p.33.District Gazetters of

India (U.P.)Vol.44.p.274, The Encyclopedia District Gazetteers of India, Vol,6,p.457.

نیز بلریا گنج کا بابو خاندان: شجرہ نسب اور مختصر تاریخ، مرتب بابو فرید خان اور بابو عبدالحئی خان، ادارہ مظہر دین، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔۱۹۸۴ء

(۲) مہاراشٹر تدریس پر مامور قصبہ کے ایک استاذ محمد عارف خان اپنی غیر مطبوعہ تحریر میں عربی تعلیم کے آغاز کا اصل محرک مولانا محمد عیسیٰ قاسمی مدظلہ کو مانتے ہیں۔ (مضمون: اسلامی مدرسہ سے جامعۃ الفلاح تک، مورخہ ۲۷/نومبر ۱۹۸۲ء، ورق ۵) ماسٹر عبدالجلیل اور مفتی عبد الرؤف مبارک پوری (اول الذکر سے انٹریو ۵/مارچ ۲۰۰۲ء اور ثانی الذکر سے انٹریو ۳۱/جنوری ۲۰۰۲ء) کی یادداشت کے مطابق ڈاکٹر خلیل احمد نے اس کار خیر کا آغاز کیا۔ حاجی امانت اللہ کے بیان کے لحاظ سے حکیم محمد ایوبؒ کی دلچسپی اس عربی تعلیم کی مہم کے پیچھے کارفرما تھی۔ جامعۃ الفلاح کی تاریخ سے متعلق بیشتر معلومات درج ذیل ماخذ سے لی گئیں ہیں:

Ghulam Nabi Teli, Jamiatul Falah in its Historical and Educational Prespective, unpublished P.hd. Thesis submitted under the supervision of Dr. Obaidullah Fahad In the Department of Islamic Studies. A.M.U. Aligarh in 2003.

(۳) حالانکہ جو نوٹس رسمی طور پر ان اساتذہ کرام کو دیا گیا اس میں صرف یہ مذکور تھا کہ مجلس منتظمہ مدرسۃ الاصلاح نے ۱۸/شعبان ۱۳۸۰ھ کے اجلاس میں نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح سے متعلق تجویز نمبر ا پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہونچی کہ موجودہ عملہ کی موجودگی میں مدرسہ کے تعلیمی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے اس لئے انھیں سبکدوش کیا جاتا ہے۔ اور شوال ۱۳۸۰ھ کے ماہ سے انھیں ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے مولانا نظام الدین اصلاحی کے نام مدرسۃ الاصلاح کا سرکاری نوٹس مورخہ: ۱۵/مارچ ۱۹۶۱ء)

(۴) روداد جماعت اسلامی ہند (اگست ۱۹۴۸ء۔جولائی ۱۹۹۶ء) ص ۲۰۷

(۵) مولانا ابوبکر اصلاحی نے قرآن کی یہ آیت تلاوت کی اور نیا نام بھی تجویز کیا (مولانا اصلاحی کا مضمون ''میرے حبیب'' حیات نو، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، اگست/۱۹۸۹ء) ڈاکٹر خلیل احمد کے بیان سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ انھیں یہ یاد نہیں

کہ سورہ مومنون کی اس آیت کی تلاوت کس بزرگ نے کی تھی۔ محمد عارف خان کا بیان اس کے برعکس ہے وہ جامعۃ الفلاح کو مولانا شبیر احمد اصلاحی کا تجویز کردہ نام بتاتے ہیں۔ دیکھئے غلام نبی تیلی، حوالہ بالا، ص ۱۰۳

(۶) رجسٹر مجلس انتظامیہ (قدیم) منعقدہ ۲۹/جون ۱۹۶۴ء کی کاروائی (غیر مطبوعہ دستور) نیز مطبوعہ تعارفی فولڈر۔ جامعۃ الفلاح۔ اغراض و مقاصد، تاریخ طباعت ندارد غالباً ۱۹۹۴ ص ۲

(۷) ۳۴/شعبان ۱۴۱۷ھ/۵/جون ۱۹۹۷ء کو مجلس شوریٰ کا منظور کردہ دستور، ص ۱

(۸) رجسٹر قدیم مجلس انتظامیہ، حوالہ بالا، ص ۵ (مجلس انتظامیہ ۵/مئی ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۴ء کی کاروائی)

(۹) تعارفی فولڈر ''جامعۃ الفلاح۔ اغراض و مقاصد'' حوالہ بالا، ص ۱

(۱۰) جامعۃ الفلاح (اردو عربی میں تعلیمی و تعمیری منصوبوں کا تعارف) رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ، ص ۹

(۱۱) مولانا محمد طاہر مدنی مہتمم تعلیم و تربیت جامعۃ الفلاح کا خطبہ استقبالیہ ۶۔۷/اگست ۲۰۰۴ء کی کارگاہ بعنوان ''مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے'' میں، جو شرکاء میں تقسیم ہوا۔ مولانا نے اپنے خطبہ کے آخر میں بطور خلاصہ جو باتیں سامنے رکھیں ان سے بھی جامعہ کا مزاج اور رجحان سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے فرمایا ''اس وقت مدارس کے خلاف پر پیگنڈہ کی جو شر انگیز مہم جاری ہے اس کا بہترین جواب اپنے حسنِ کارکردگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے نوجوانوں کو سماج میں لانا ہے جو اپنے علم اور حسنِ اخلاق کے لحاظ سے ممتاز ہوں اور وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی تعمیر و اصلاح کا کام بہتر انداز سے کر سکتے ہوں۔ ہمارے فارغین ہی دراصل ہمارا تعارف ہیں اس لئے اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں نصاب تعلیم میں موثر اور نتیجہ خیز تبدیلیوں سے ہمیں ہرگز گھبرانا نہیں چاہئے۔ آج درس نظامی کے نام سے جو نصاب بر صغیر کے طول و عرض میں رائج ہے وقت کے ساتھ اس میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ندوۃ العلماء کی تحریک بنیادی طور پر اصلاحِ نصاب اور قدیم و جدید کے فاصلوں کو کم کرنے کی تحریک تھی اور اس ضمن میں اس نے نمایاں کام کیا۔ تحریک اسلامی ہند اور تحریک اہل حدیث کے زیر اثر تعلیمی ادارے بھی جدید و قدیم کے امتیاز کو ختم کرنے کے علم بردار ہیں۔ البتہ نصاب کے تعلق سے ہمیں ہر مرحلہ میں اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ مدارس کا بنیادی مقصد اور کردار متاثر نہ ہو اور ان کا

اصل تشخص پوری طرح باقی وقائم رہے۔ مدارس کا اصل مقصد علوم شریعت کے ماہرین اور دعوت واصلاح کا کام کرنے والے رجال کار کی تیاری ہے۔ اس ضمن میں ہمارا نظام تعلیم وتربیت کتنا کامیاب ہے اس کا بے لاگ جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔''

(۱۲) مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کا بڑا علمی کارنامہ فکر فراہی کی روشنی میں عربی زبان میں تفسیر قرآن پاک میں نظم ومناسبت کا اطلاق ہے جو '' البرهان فی نظام القرآن '' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اس پر مولانا کو دکتوراہ کی ڈگری بھی تفویض کی گئی۔ مگر شریعت اسلامی میں سزائے رجم کے انکار کے نظریہ پر مبنی ان کی کتاب ''حقیقتِ رجم'' نے بڑا واویلا مچایا۔ جامعہ کے اندر اور باہر حمایت ومخالفت کی گرم بازاری ہوئی۔ اس کتاب کی تردید میں کئی تحقیقات منظر عام پر آئیں۔ دیکھئے درج ذیل کتابیں:

حکیم محمد ایوب ''ایک فکری فساد اور اس کا علاج''، نیز انیس احمد فلاحی مدنی ''تحقیق سے تحریف تک'' حیات نو، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ''حقیقت رجم۔ ایک تنقیدی جائزہ''

(۱۳) جامعہ کا ایک امتیاز وہ شورائی وجمہوری طریقہ کار ہے جو دینی مدارس کے یک قطبی ماحول میں بڑا اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ جامعہ کے ناظم اعلیٰ کا انتخاب مجلس انتظامیہ (اور اب نئے دستور کے مطابق مجلس شوریٰ) کرتی ہے۔ ایک فرد نے بسا اوقات متعدد میقاتوں میں ناظم منتخب ہو کر اپنے فرائض انجام دیئے اور اپنے منصب سے دست بردار ہو کر بھی تعمیر وترقی کے کاموں میں وہ دلچسپی لیتے رہے۔ درج ذیل فہرست سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:

علی محمد خان مرحوم (منیجر مکتب اسلامیہ) ۱۹۱۴۔۱۹۲۷ء

محمد حنیف خان مرحوم '' '' ۱۹۲۷۔۱۹۵۴ء

حاجی امانت اللہ '' ۱۹۵۴ء۔۱۹۵۶ء

عبدالمجید خان مرحوم (منیجر مدرسہ اسلامیہ) ۱۹۵۶۔۱۹۶۰ء

حاجی محمد اکرام خان پردھانؒ (ناظم جامعہ اسلامیہ وجامعۃ الفلاح) ۱۹۶۰۔۱۹۶۳ء

ڈاکٹر خلیل احمد مدظلہ (ناظم اعلیٰ جامعۃ الفلاح) [۱] ۱۹۶۳۔۱۹۶۹ء

[۲] ۳؍مئی ۱۹۹۰ء تا ۲۴؍جنوری ۱۹۹۳ء

[۳] ۱۹؍دسمبر ۱۹۹۶ء تا ۲۵؍مئی ۲۰۰۰ء

مولانا جلیل احسن ندویؒ (ناظم اعلیٰ) ۱۴؍مارچ ۱۹۶۹ء تا ۱۳؍ستمبر ۱۹۶۹ء

مولانا ابوبکر اصلاحیؒ	"	۱۴ر ستمبر ۱۹۶۹ء تا ۷ر نومبر ۱۹۷۲ء
مولانا محمد عیسیٰ قاسمی مدظلہ	"	[۱] ۸ر نومبر ۱۹۷۲ء تا ۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء
		[۲] ۱۷ر نومبر ۱۹۸۱ء تا ۱۸ر اپریل ۱۹۸۲ء
مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ	"	۸ر دسمبر ۱۹۷۹ء تا ۱۷ر نومبر ۱۹۸۱ء
مولانا صدرالدین اصلاحیؒ	"	۱۸ر اپریل ۱۹۸۲ء تا ۳ر مئی ۱۹۹۰ء
حاجی عبدالمتینؒ	"	۲۴ر جنوری ۱۹۹۳ء تا ۲۷ر دسمبر ۱۹۹۵ء
مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ		۲۷ر دسمبر ۱۹۹۵ء تا ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء

اس کے بعد سے تا حال شیخ الجامعہ (دستور میں ترمیم کے بعد)

مولانا ابوالبقاء الندوی مدظلہ	۲۵ر مئی ۲۰۰۰ء تا حال

(غلام نبی تیلی، حوالہ بالا، ص ۲۳۷۔ ۲۳۸)

(۱۴) مدارس اسلامیہ کے وفاق کی یہ تجویز ماہرینِ تعلیم اسلامی برابر پیش کرتے رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے ندوۃ العلماء تحریک کے اولین اجلاس میں اس پر زور دیا تھا کہ "اس امر میں سعی کی جائے کہ مدارس اسلامیہ جو کثرت سے جا بجا قائم ہیں، ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے مدرسے مثلاً مدرسہ دیوبند، مدرسہ فیض عام کانپور اور مدرسہ احمدیہ آرہ وغیرہ بطور دار العلوم قرار دیئے جائیں اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کاروائی ان دار العلوموں کی نگرانی میں رہے"

(حیات شبلی، اعظم گڑھ، ص ۳۰۷۔ ۳۰۸)

مگر آج تک وفاق کی یہ تجویز ایک خواب پریشاں ہی رہی، جب تک مقتدر مدارس کے ارباب حل وعقد کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھائیں گے۔ مستقبل میں بھی یہی کہنا ہوگا کہ:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

xxxxxxxxxxxxxxxxx

بہت زرخیز ہے ساقی!

غیر مسلموں سے تال میل:

بلاشبہ ہندوستان کے دینی مدارس بغیر کسی تخصیص کے دین کی دعوت واشاعت، دفاع و اصلاحِ امت کی ایک عظیم الشان تاریخ رکھتے ہیں، ان کا ماضی بھی تابناک ہے اور حال و مستقبل بھی اسلامی امیدوں کی آماجگاہ، اسلامی تشخص کی بقا وحفاظت اور اسلامی تہذیب کی پرداخت کا اسلحہ خانہ ہے۔ یہ مدارس امت مسلمہ کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کے اندر قرآن وحدیث کا علم عام کررہے ہیں اور مسلمانوں کو اسلامی شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتے اور ملکی وقومی فرائض کے تئیں ان کو تعمیری کردار ادا کرنے پر ابھارتے ہیں۔ عام طور پر ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کی تاریخ وتہذیب، دین و مذہب اور نفسیات ومنہاجیات کا مطالعہ ان مدارس کے نصاب میں شامل ہے نہ ان سے کسی منصوبہ بند تعامل، ارتباط، افادہ واستفادہ ان کے پروگرام کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہندوؤں اور عیسائیوں کے درمیان دعوتی جدو جہد کی مہم کا سراغ بھی بمشکل ان مدارس کی تاریخ میں ملتا ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولوی حسن علی، مولانا محمد علی کانپوری، مولانا مشرف الحق، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی قبا حسین، مولانا ثناء اللہ امرتسری (۱) وغیرہ قابل قدر علماء کرام ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی، ذوق وشوق اور داعیانہ اسپرٹ کی وجہ سے مناظروں میں حصہ لیا۔ ان مناظروں کی زیادہ تر حیثیت دفاعی تھی تاہم ان سے تبلیغ اسلام کے دروازے کھلے اور غیر مسلموں کو اسلام کی صداقت وحقانیت کو پرکھنے کا موقع ملا اور وہ بڑی تعداد میں مشرف بہ اسلام بھی ہوئے۔ بلاشبہ یہ دعوتی جدو جہد مدارس کی تعلیمی واصلاحی منصوبہ بندی کے دائرہ سے باہر رہ کر انجام دی گئی تھی۔ اس کارخیر میں مدارس کے نظامِ تعلیم وتربیت کا راست کوئی حصہ نہ تھا۔

یہ ایک غور طلب پہلو ہے۔ ایک سو دس کروڑ آبادی والے ملک کی پچاسی فیصد غیر مسلم اکثریت کا ان مدارس سے براہ راست کوئی رابطہ ہے نہ ان کے افادہ واستفادہ کی کوئی صورت

ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ بعض غیر مسلم حلقوں کی جارحانہ سوچ، زعفرانی ذہنیت رکھنے والوں کی متعصبانہ فکر کے علی الرغم غیر معمولی اسلامی احتیاط اور پیش بندی کی مصلحت اور حکمت ہو مگر یہ تو پسپائی ہے اقدام نہیں۔ دست برداری ہے پیش قدمی نہیں۔ دعوت اور تجدید کا مزاج آگے بڑھنے اور دوسروں کو اپنے اندر سمو لینے کا ہے، پیچھے ہٹنے اور اپنے خول میں سمٹ جانے کا نہیں۔

فاصلہ کی دیواریں:

ہر دور کے طاغوتی نظام کے علم بردار مختلف سیاسی، حربی اور نفسیاتی ہتھکنڈوں کے ذریعہ داعی اور مدعو قوم کے درمیان فاصلہ کی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جارحیت کی دیوار باہمی منافرت کی دیوار، غیر ضروری مسائل کی معرکہ آرائی کی دیوار، پروپیگنڈہ مہم کی دیوار، مداہنت اور وحدت ادیان کی دیوار، اسلاموفوبیا کی دیوار۔ مگر حکمت، عزم واحتیاط، بصیرت و دانش وری، فراست اور معاملہ فہمی کے ذریعہ ان دیواروں کو ڈھانا ہی دعوت کی راہ کھولنا ہے۔ مکالمہ و افہام وتفہیم اور بہتر تعامل وارتباط، علمی سطح پر اور عملی سطح پر بھی۔ اور یہی کلید ہے بقائے باہم کی بلکہ اشاعت وفروغ دین کی۔

آج ہندو اکثریتی طبقہ مدارس کے تعلق سے کسی قدر غلط فہمی کا شکار ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ہندو صحافی اور دانش ور کنچن گپتا۔ پانیر انگریزی اخبار کے ۳۱ر جولائی ۲۰۰۵ء کے شمارہ میں ایک مقالہ تحریر کرتے ہیں جس کا عنوان ہے:

Govt. blind to madrasas breeding terror

(دہشت گردی کو فروغ دینے والے مدارس کی طرف سے حکومت کی آنکھیں بند ہیں)

یہ مقالہ مدارس کے خلاف الزامات اور بے جا شبہات سے پُر ہے مثلاً

(۱) مدارس بیرونی ممالک کے فنڈ سے چلتے ہیں جن میں پاکستان کا آئی ایس آئی بھی شامل ہے۔

(۲) مدارس اسلامی دہشت گردی کی کارگاہ اور نرسری ہیں۔ یہ بنیاد پرستی (Fundamentalism) اور خود محصوری (Exclusivism) کی تعلیم دیتے ہیں۔

(۳) حکومت اس بات پر توجہ نہیں دیتی کہ ان مدارس کی آمدنی کیا ہے؟ بیرونی ممالک سے ان کی بازیافت کیسے ہوتی ہے؟ اور علماء بیرونی ممالک کے اسفار کس طرح کرتے ہیں۔

(۴) آسام، مغربی بنگال، بہار اور اتر پردیش میں مدارس کے ذریعہ بیرونی ممالک۔

کی ایجنسیاں خیراتی ادارے قائم کرتی ہیں اور اپنا اثر ونفوذ بڑھاتی ہیں۔ کیرالہ کے مالا پورم میں مدارس بطور خاص نشانہ ہیں، مولویوں کے بھیس میں یہ ایجنسیاں اپنا نیٹ ورک مضبوط کرتی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ (۲)۔

مدارس کے خلاف طوفان بد تمیزی میں مسلسل شدت آتی جارہی ہے۔ ۷/ جولائی ۲۰۰۵ء کے لندن بم دھماکوں کے بعد اب عالمی ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا نے مدارس کے خلاف مضامین، تحقیقات اور تبصروں کا ایک اشتعال انگیز سلسلہ شروع کردیا ہے۔ یہ تمام الزامات اور اعتراضات بلاشبہ تعصب یا غلط فہمی کا نتیجہ ہیں مگر کیا اس سے خود احتسابی کا سبق ہمیں نہیں ملتا؟ کیا یہ وقت کا تقاضا نہیں ہے کہ مسئولیت اور شفافیت کو مزید بہتر بنایا جائے۔ غیر مسلم برادران وطن کی تاریخ وتہذیب اور تحریکات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے ان کے مذہب اور رسوم وروایات سے گہری واقفیت ہو۔ ان کی نفسیات اور منہاجیات کا ادراک ہو۔ ان سے مکالمہ کا آغاز ہو۔ افادہ واستفادہ کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔ اپنے محصور ماحول سے نکل کر ان سے رابطہ استوار کیا جائے اور پُر امن اور دوستانہ ماحول میں نتیجہ خیز گفت وشنید ہو کہ اسی سے دعوت کی راہ باز ہوگی اور ملک میں امن وسلامتی قائم ہوگی۔

کھلے ماحول کی ناگزیریت:

اس سیاق میں خود محصوری اور اپنی فضاؤں کی قفل بندی کی ذہنیت اور پالیسی کو بڑی حد تک نقصاندہ سمجھنا قرین انصاف بھی ہے اور تقاضائے حالات بھی۔ باہر کی زیب وزینت، دنیاوی لہو ولعب اور عیش کوشی وتن آسانی کے وسائل سے دست کش رہنا بلاشبہ مدارس اسلامیہ کی دینی ودعوتی فطرت اور الوہی نصب العین کا عین تقاضا ہے مگر جدید حالات، بدلتے رجحانات، نت نئے افکار ونظریات سے واقف ہونا اور گردوپیش کے ماحول پر عبور رکھنا انتہائی ناگزیر ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ذہن ودماغ کے روزن کھلے رہیں، عقیدہ وفکر کی سلامتی کے ساتھ نئے چیلنج اور نئے بحران کا مقابلہ کیا جائے اور قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول اکرم ﷺ کے اسوہ کو سامنے رکھ کر ایک نئی پالیسی اور پروگرام وضع کیا جائے جس میں زیادہ زور ہندوستان کے مقامی حالات، مقامی تہذیب وثقافت، تاریخ وفلسفہ، مذہب وسماج کے بہتر تعامل پر ہو۔ گویا ایک طرح سے مدارس کے نظام ونصاب کو ہندوستان کی دینی ودعوتی ضروریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ بنایا

جائے۔ مکتب کی نصابی کتب اور اساتذہ کی نظریہ کاری کے پروگرام سے اس مہم کا آغاز ہوگا اور دینی مدارس وجامعات کے نصاب ونظام تعلیم کی تشکیل نو (Over hauling) پر یہ منتج ہوگی۔

بڑی عجیب وغریب صورت حال یہ ہے کہ مدارس کے طلبہ واساتذہ ہندی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں اور قومی زبان کے سیکھنے سکھانے کو کسرِ شان اور باعثِ استخفاف سمجھتے ہیں۔ عربی زبان سے محبت وعقیدت اپنی جگہ، کہ یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے اور اس کی تعلیم وتدریس ہماری مذہبی زندگی کی موت وزیست کا مسئلہ ہے۔ اردو ہماری ثقافتی اور بڑی حد تک دینی زبان ہے مگر ہندی تو ہماری قومی زبان ہے۔ ملکی تہذیب کا اثاثہ ہے، اس ملک میں باوقار زندگی گذارنے کے لئے اس کا فہم وادراک ضروری ہے اور مدارس کے تحفظ وبقا اور ان کی دعوتی مشن کی تکمیل کے لئے اس زبان پر عبور حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ جنوبی ہند کے مدارس نے عام طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور اپنی مقامی زبانوں کو جزو نصاب بنالیا ہے شمالی ہند ابھی تک اتنی بڑی حقیقت کو ہضم نہیں کرسکا ہے اور اس کے نتیجہ میں ملک کی اکثریت اور علماء کرام کے درمیان راست تال میل نہیں ہوسکا ہے۔ ہمارے طلبہ اور علماء کی تقریریں اور تحریریں ہندو بھائیوں کی سمجھ اور دلچسپی سے ماوراء ہوتی ہیں ہندوؤں کے جلسہ میں اظہار خیال کرنے کے لئے مناسب حال مقرر کی تلاش ہوتی ہے۔ حلیہ، وضع قطع اور فکر میں دوری پہلے سے ہے کہ معاملہ توحید اور شرک کے فاصلہ کا ہے۔ اس فاصلہ کو کم کیا جاسکتا ہے افہام وتفہیم سے۔ مکالمہ اور معاشرت سے، دعوتی حکمت وفراست اور موعظت حسنہ سے۔ مگر یہاں معاملہ ''زبانِ یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم'' کا ہے۔ داعی اور مدعو قوم کے درمیان یہ حجاب ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ جب تک یہ حجاب نہیں اٹھتا غلط فہمیاں باقی رہیں گی، شکوے اور اضطرابات جنم لیتے رہیں گے اور معمولی چنگاریوں کو تخریب پسند عناصر شعلوں میں تبدیل کرکے نشیمن کو خاکستر کرتے رہیں گے۔ دنیا کے بیشتر ملکوں میں وہاں کے مسلمانوں نے مقامی زبان وثقافت سے اپنی اجنبیت ختم کرکے دعوتی ودینی تقاضوں کی تکمیل کے راستے روشن کرلئے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس سے مفر نہیں ہے۔ اب تو صورتِ حال اتنی تشویش ناک ہوگئی ہے کہ خود مسلمانوں کی نئی نسل اردو نہیں سمجھتی۔ نماز روزہ کے احکام معلوم کرنے کے لئے انہیں ہندی میں کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے ادارہ میں بی اے سال اول کے مسلمان طلبہ کی بھاری اکثریت دینیات کے لازمی مضمون کا امتحان ہندی

زبان میں دیتی ہے۔ یہ ایک ناخوشگوار تبدیلی ہے اور کسی بھی تبدیلی کو الٹے پاؤں لوٹایا نہیں جاسکتا ۔اسے بدرجۂ مجبوری قبول کر کے بدلے ہوئے حالات کا حکمت سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

مدارس کا ماحول اور وہاں کی علمی ودینی فضا عام طور پر ہندوؤں کے لئے بڑی ''پُر اسرا'' ہوتی ہے۔ بلاشبہ دستور ہند نے ہمیں اپنے ادارے خودمختارانہ چلانے کی آزادی دے رکھی ہے اور سیکولر جمہوریت کی اس نعمت سے مستفید ہونے کا ہمیں حق ہے اور ہم اس حق کا بھرپور استعمال کررہے ہیں مگر دعوتی نقطۂ نظر سے اس ''پُر اسرار'' ماحول کو عام اور جگ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ماحول میں سنجیدہ، شریف، ایماندار، خداترس، تعمیر پسند اور خادم انسانیت طلبہ کو تیار کرنے کا جو عظیم الشان کام انجام پاتا ہے اس سے واقف ہونے اور اپنی وسعت وصلاحیت کے مطابق مستفید ہونے کا حق ہندو بھائیوں کو بھی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایسے پروگرام تشکیل دیئے جائیں جن کے ذریعہ ہندو عوام وخواص ہماری کارکردگی سے آشنا ہوتے رہیں، ہم ان کے مخلص طبقہ کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، مشترک مقاصد وامور میں ان کا تعاون لیں اور ہم آہنگی، فرقہ وارانہ سلامتی کے قیام میں دونوں مل کر اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ اس کے لئے علمی وعملی دونوں سطحوں پر تال میل پیدا کرنا ضروری ہے۔

علمی تال میل کی مختلف صورتیں اپنائی جاسکتی ہیں ۔ یوم آزادی، یوم جمہوریہ، گاندھی جینتی، عید میلادالنبی، محرم، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ کے علاوہ دوسری تقریبات میں بھی انہیں برابر دعوت دی جائے، عوام کو بھی اور خواص کو بھی۔ خاص طور سے مقامی ہندوؤں کو بطور خاص ان تقریبات میں پورے اہتمام سے بلایا جائے۔ ان کی اکثریت کو یقینی بنایا جائے اور عام فہم زبان میں ان سے گفتگو کی جائے۔ اس سے مقامی عوام کا اعتماد حاصل ہوگا اور خوبصورتی اور حکمت سے دین کی بنیادی باتیں ان کے کانوں میں پڑیں گی۔

ہندوؤں کے مذہبی رہنما، اہل علم، دانش وران، تعلیم وتدریس سے وابستہ حضرات اور صحافت سے منسلک سنجیدہ افراد کے توسیعی خطبات بھی مدارس میں منظم کئے جاسکتے ہیں۔ ہندو مذہب، اس کی تاریخ وثقافت، سماجی وعمرانی تبدیلیوں، مذہبی وسماجی شخصیات، خدمت خلق کے سرکاری وغیرسرکاری اداروں، احیائی ذہنیت کی علم بردار تحریکوں، ہندو۔ مسلمان مشترکہ خدمات، جنگ آزادی کے مختلف مراحل میں دونوں قوموں کی جدوجہد وغیرہ موضوعات پر سنجیدہ اور علمی گفتگو سے مطالعۂ مذاہب کی راہ بھی ہموار ہوگی اور علمی وتہذیبی افادہ واستفادہ کی شکلیں بھی وا

ہوں گی۔ اس ضمن میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان ہندو شخصیات کی آمد سے کوئی خاص نتیجہ خیز مہم شروع نہ ہو سکے گی جو ہندوؤں میں کوئی اعتبار و استناد نہیں رکھتے اور مسلمانوں کے درمیان مقبول ہونے کے لئے ہندو مذہب پر جا و بے جا تنقید کرتے ہیں۔ اس طرح کی تنقیدیں اصلاح و تعمیر کی راہ میں مزاحم ہوتی ہیں۔ آج کل بعض ہندو رہنما مختلف مسلم جماعتوں کے اسٹیج سے تقریر کر کے میڈیا میں مشتہر ہو رہے ہیں حالانکہ ہندو سماج میں خود ان کا کوئی وزن نہیں ہے نہ علمی و دانشورانہ سطح پر ان کی کوئی اہمیت ہے۔ ان افراد سے رابطہ بنانا مفید ہوگا جو علمی و صحافتی حلقوں میں رسوخ رکھتے اور ہندوؤں کی فکر پر اپنے اثرات مرتسم کرتے ہیں اور بحیثیت مجموعی ہندو سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس تال میل میں کچھ نزاکتیں، دشواریاں اور پیچیدگیاں سامنے آئیں، بعض تلخ حقائق کو برداشت کرنا پڑے، خود احتسابی کی کٹھن ڈگر سے گزرنا پڑے۔ صبر و تحمل اور اعتراف سے کام لینا پڑے مگر دیرپا نتائج بہرحال خوشگوار ہوں گے۔

عملی تال میل میں اور تعاون اور اشتراک کی شکلیں روزمرہ کی زندگی میں بہت سامنے آتی ہیں مگر انہیں دنیاوی سیاست کا حصہ سمجھ کر سیاست دانوں کو آگے بڑھا دیا جاتا ہے اور وہ ان اقدامات اور مواقع کو وسیلہ ''فتوحات'' تصور کر کے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ عام طور پر علماء اور اربابِ مدارس ان معاملوں میں نہیں الجھتے۔ اگر عملی سطح پر ہندوؤں سے تال میل ہو جائے تو غلط فہمیاں خود بخود رفع ہوتی رہیں گی۔ جو علماء ہندوؤں سے راست رابطہ میں ہیں اور وہ روزمرہ کے مسائل میں ان سے اشتراک و تعاون کرتے ہیں ان کے تجربات کافی حوصلہ افزا ہیں۔

مسلکی ہم آہنگی:

مختلف مدارس کے درمیان مسلکی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ شیعہ و سنی، دیوبندی و بریلوی کشاکش نے اسلام اور اہل اسلام کی بڑی ہوا خیزی کی ہے اور ملت واحدہ کی بیشتر توانائیاں انہی مسلکی فتنوں کو ہوا دینے یا دبانے میں صرف ہوتی ہیں۔ عوامی سطح پر اس طرح کے جتنے فتنے سر اٹھاتے ہیں ان کے ڈانڈے کسی نہ کسی طرح مدارس سے ملتے ہیں۔ بیشتر مدارس کا منہج تعلیم و تربیت فرقہ وارانہ اور مسلکی ہے۔ وہاں کے تدریسی اور غیر نصابی ماحول پر کسی ایک مسلک کی جا و بے جا حمایت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ باہر عوام میں یہی طلبہ ان فرقہ وارانہ جراثیم کے زہر گھولتے ہیں اور معمولی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آجاتی ہے۔ ۲۰۰۴ء کے

ماہ رمضان المبارک میں جھانسی کے مسلمانوں میں جو قتل وخون ہوا اس کی ذمہ داری تمام تر اسی مسلکی ذہنیت پر عائد ہوتی ہے۔ نماز فجر کے معا بعد مسجد کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ایک مسلک کے امام پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور وہ موقع واردات پر ہلاک ہو گئے۔ ردّ عمل میں دوسری مسجد کے امام کو جو دوسرے مسلک کے پیرو تھے، قتل کر دیا گیا۔ یہ دونوں گروہ دیوبند اور بریلوی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس فرقہ وارانہ سوچ نے دونوں مسلکوں کے طرف داروں کو رسول مقبول علیہ ﷺ کے اس فرمان برحق کا مصداق قرار دے دیا کہ: ''القاتل والمقتول کلا هما فی النار'' کتنا شرمناک بیان تھا مسلم پرسنل لا بورڈ جدید کے جنرل سکریٹری مولانا توقیر رضا خان قادری کا جنہوں نے (راشٹریہ سہارا ۱۶ر فروری ۲۰۰۵ء) مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ کی، متفقہ ملی پلیٹ فارم ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کو زمین بوس کرنے کا اعلان کیا اور نئے بورڈ کی رکنیت کے لئے یہ شرط رکھی کہ وہ شیعہ نہ ہو اور ائمہ اربعہ کا مقلد ہو۔ قرآن وسنت کے بجائے '' تقلید ائمہ'' کی شرط رکھنا اور وحدت ملت سے شیعہ حضرات کو بانگ دہل نکالنے کی جسارت کرنا، کیا اہل اسلام کی خدمت تھی؟ مسلم پرسنل لا بورڈ سے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو شکایات رہی ہیں۔ پچھلے دنوں پروفیسر طاہر محمود اور جناب محفوظ الرحمٰن کی جانب سے اس طرح کے بعض مسائل اردو اخبارات میں شائع بھی ہوئے ہیں جن کا انداز باوقار اور متین تھا۔ بورڈ کی کارکردگی، بحث و مباحثہ کا طریق کار، ملی مسائل کے تئیں اس کی سنجیدگی، قیادت کی فراست وبصیرت پر بہت سے اشکالات قائم ہوتے رہے ہیں لیکن انہیں حکمت ودانشمندی کے ساتھ علماء اور ارباب دانش کے سامنے پیش کرنا اور ان پر شورائی انداز میں مباحثہ کرانا ایک الگ مسئلہ ہے جو مطلوب ہے۔ بورڈ کے اندر افتراق وانتشار پیدا کرنا یا اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے نئے بورڈ کی تشکیل کرنا بالکل دوسرا مسئلہ ہے، جو مذموم ہے۔

امت مسلمہ کے اندر وسیع تر اتحاد پیدا کرنے اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر دین متین کی دعوت وخدمت کے مبارک کام میں لگانے کے لئے ضروری ہے کہ فقہی ومسلکی اختلاف کو بڑھاوا نہ دیا جائے۔ غلو، تشدد، دھڑے بندی سے پرہیز کیا جائے۔ فقہی وقانونی مسائل میں کشادہ دلی، اعلیٰ ظرفی اور وسیع النظری کا ثبوت دیا جائے۔ مسلکی رواداری اور افہام وتفہیم سے کام لیا جائے۔ اس سیاق میں برصغیر ہند وپاک کے نامور عالم دین مولانا مفتی محمد شفیعؒ کا بیان کردہ ایک واقعہ نقل کرنا مفید ہوگا جو اپنے اندر عبرت کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

مفتی محمد شفیعؒ کے استاد اور علمائے دیوبند کے سرخیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ قادیان کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ایک موقع پر مفتی صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ایک صبح نماز فجر کے وقت حاضر خدمت ہوئے تو دیکھا کہ علامہ موصوف سر پکڑے ہوئے مغموم بیٹھے ہیں۔اس کے بعد کے واقعات مفتی صاحب کے بیان کے مطابق اس طرح ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا: ہاں ٹھیک ہی ہے۔میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کردی! میں نے عرض کیا: حضرت آپ نے ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟

فرمایا: میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کردی!

میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں۔امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔یہ رہا محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کردی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ اُن کو اللہ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام خود لوگوں سے اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسلک کے فقہاء جن کے مقابلہ میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطا'' (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کردیں اور دوسرے کے مسلک کو ''خطا محتمل الصواب'' (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا، جن میں ہم مصروف ہیں!

پھر فرمایا: ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون خطا.........تو جس چیز کو نہ دنیا میں کبھی نکھرنا ہے، نہ برزخ میں، نہ محشر میں، اُسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اپنی قوت صرف کر دی۔ اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جارہی ہے! یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار اُن کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہئے تھا، وہ پھیل رہے ہیں! گمراہی پھیل رہی ہے! الحاد آرہا ہے اور شرک و بت پرستی چل رہی ہے۔ حرام وحلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی وفروعی بحثوں میں!

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی! (۳)

مفتی محمد شفیعؒ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے، جو بہت اہم ہے۔ مالٹا کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد ایک روز دار العلوم میں علماء کے بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے حضرت نے مسلمانوں کی تباہی کے اسباب بیان فرمائے: ایک قرآن مجید کی تعلیمات کو چھوڑ دینا اور دوسرا باہمی اختلافات اور جنگ و جدال۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا: اسے کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔ (۴)

ترجیحات کا تعین:

پچھلی چند دہائیوں سے مدارس اسلامیہ کے درمیان نت نئے تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے مسابقت کا بازار گرم دکھائی دیتا رہا ہے۔ ہر مکتب جامعہ کا پیراہن اوڑھنے کے لئے بیتاب ہے اور اس کا واحد معیار طول طویل عمارتوں کی تعمیر اور عربی کے تمام درجات کی تدریس وتعلیم کا اخباری اعلان رہ گیا ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس عالم دین کو مشرق وسطٰی کے بعض وسائل ہاتھ لگ گئے اس نے بغیر سوچے سمجھے ایک مدرسہ کی تاسیس کا اعلان کر دیا اور چشم زدن میں فلک بوس عمارتیں کھڑی ہو گئیں بسا اوقات ایک چھوٹے قصبہ میں ایک ہی مسلک کے دو علماء میں اختلاف ہوا اور دو مدارس وجود میں آگئے۔ پھر مسابقت کا ماحول بنا تو دونوں نے ضروریات و

ترجیحات کا تعین کئے بغیر لق ودق عمارتیں تعمیر کرلیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اور مقامی مسلمانوں میں اپنے اثرات بڑھانے کی خاطر علمی مذاکروں کا سلسلہ شروع کردیا، جلسے جلوس ہونے لگے۔ باہر کے مہمانوں کی ضیافت ہونے لگی، اردو اور عربی ترجمانوں کی اشاعت کا بھی آغاز ہوگیا اور اس تمام تگ ودو کے پیچھے کوئی مضبوط منصوبہ بندی کارفرما نہ رہی۔ تعلیم اور تربیت کے معیار پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ بس کمیاتی ترقی کی فکر دامن گیر رہی۔ ملک کے اعلیٰ ترین مدارس کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھئے۔ ان کے یہاں نصابِ تعلیم کو update کرنے کی مدتوں سے کوئی نشست، کوئی اجلاس منعقد نہ ہوسکا۔ اہل علم سے اس سلسلہ میں کوئی مشاورت نہ ہوئی۔ اور تربیت و تعلیم کے معیار پر کوئی منصوبہ بندی تو گویا قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کچھ وعظ و نصیحت اور ترغیب و تشویق، اللہ اللہ خیر صلا۔ مدارس کی بڑھتی ہوئی تعداد اور تعلیمی و تدریسی منصوبوں کی بے سود اور بے نتیجہ تکرار، امت کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا الل ٹپ استعمال (جو بسا اوقات استحصال میں بدل جاتا ہے) اِن سب پر روک لگانا ضروری ہے۔

تعلیمی معیار کی ابتری کا یہ عالم ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی اے (عربی) سال اول میں داخلہ کے خواہش مند طلبہ کا انٹرویو ہورہا تھا برادر محترم پروفیسر خالد حامدی نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ مدارس دینیہ کے طلبہ ازواج مطہرات کا نام نہ بتا سکے اور ایک طالب علم نے تو اس قدر جہالت کا ثبوت فراہم کیا کہ حضرت فاطمہ زہراؓ کو اس فہرست میں شامل کردیا العیاذ باللہ!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دینی مدارس کے طلبہ/طالبات فضیلت کے بعد ایم اے (عربی) میں داخل ہوتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ ڈاکٹر فیضان احمد اور ڈاکٹر محمد سمیع اختر وغیرہ کو برابر شکایت رہتی ہے کہ مدارس کے طلبہ و طالبات بھی ابتدائی نحوی و صرفی قواعد سے نابلد دکھائی دیتے ہیں اور تاریخ اسلام اور تاریخ ادب عربی میں ان کی معلومات عام طور پر صفر ہوتی ہیں۔ ایک بار خود مجھے طالبات کے ایک ممتاز دینی ادارہ کی فضیلت اول کے مضمون فقہ کی امتحانی کاپیاں بحیثیت ممتحن دیکھنے کو ملیں تو سر پیٹنے کو جی چاہا۔ اسی طرح لڑکیوں کی اعلیٰ درس گاہ کے معائنہ سے منکشف ہوا کہ اردو زبان تک بولنے اور لکھنے میں انہیں دقت ہوتی ہے۔

دینی و اسلامی تربیت کا معاملہ زیادہ دگرگوں ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کا معیار و کردار کچھ زیادہ متاثر کن نہیں ہے۔ نمازوں کی پابندی سے

لے کر مخربِ اخلاق فلموں سے اجتناب اور عام معاشرتی برائی سے پرہیز تک کوئی ایسی شرعی و مذہبی خوبی نہیں ہے، جس میں وہ عام طلبہ سے ممتاز ہوں۔ پھر وہ ایک عالم دین کی پہچان اور مدرسہ کی شناخت قائم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یونیورسٹی و مدرسہ کے ماحول سے باہر عام معاشرہ میں بھی یہ طلبہ اپنی انفرادیت عام طور پر قائم نہیں رکھ پاتے۔

بلاشبہ اس تعیم میں استثناء موجود ہے۔ ایسے طلبہ و علماء بھی معاشرے میں اور علمی و تدریسی اداروں میں موجود ہیں جن پر ملت کو ناز ہے اور جو دین متین کی سنجیدہ خدمت میں مصروف ہیں مگر بحیثیت مجموعی تصویر کا رخ بہت زیادہ روشن نہیں ہے۔

شورائی مزاج کو فروغ دینا:

آمریت، استبداد، خودرائی، اپنی ہی رائے کو ہر حال میں حق اور دوسروں کی رائے کو باطل ماننا اور مسلمانوں کی عمومی نمائندگی کی جگہ کسی خاندان، شخصیت یا برادری کو مرکزی مقام دینا یہ ساری چیزیں اسلام کے شورائی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ مرکز ابوالکلام آزاد للتوعیہ الاسلامیہ نئی دہلی دو دہائی قبل ترقی کے بام عروج کو چھو رہا تھا مگر آمرانہ مزاج اور خودرائی نے اس کی مجلس منتظمہ کو دو دھڑوں میں منقسم کر دیا اور دونوں گروہ باہمی تصفیہ کے لئے ملکی عدالت میں مقدمہ دائر کر بیٹھے۔ دارالعلوم دیوبند اسی استبدادِ فکر کا شکار ہوا۔ اور اس کے دو متصادم فریقوں نے الگ الگ دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی دونوں اپنی عمارتوں، وسائل اور تعداد طلبہ و اساتذہ کے اعتبار سے روبہ ترقی ہیں مگر دلوں میں جو کدورت و عناد اور افتراق و انتشار نے بسیرا کیا تو آج تک تمام کوششوں کے باوجود اس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں پچھلے دنوں میں جو فتنے رونما ہوئے اُن کی وجہ یہی آمریت اور استبدادی سوچ تھی۔ اس وقت جمیعت علماء ہند کی صدارت کے مسئلہ پر اخبارات میں جو حمایت و مخالفت کی گرم بازاری ہو رہی ہے اس کے پس پشت بھی یہی مرض کام کر رہا ہے۔ ۲۸ر فروری ۲۰۰۶ء کی شام کو جمیعت کی مجلس منتظمہ کے اجلاس میں جو دھینگا مشتی ہوئی (۵) وہ ایک خرابی تھی انتخاب صدارت کا جو غیر جمہوری و غیر دستوری اعلان ہوا وہ دوسری خرابی تھی۔ (۶) نومنتخب صدر نے عاجزی و خاکساری اور کسی منصب کو قبول کرنے کی خواہش نہ رکھنے کا جو صوفیانہ عزم ظاہر کیا اور درون خانہ کی سیاست نے اس بھرم کو جس

طرح طشت از بام کیا وہ منافقت کی تیسری بیماری تھی اور اب تمام علماء اور اصحاب قلم اس غیر جمہوری عمل کو خدا اور رسول کا واسطہ دے کر جس طرح سندِ جواز عطا کر رہے ہیں اور روزانہ اخبارات میں زبردستی کی جو مبارکبادیاں شائع ہو رہی ہیں وہ ظُلمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعض کی تصویر پیش کر رہی ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کے ''چچا اور بھتیجے'' کا یہ اختلاف دو نظریوں کے اختلاف کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ ایک نظریہ ''جمیعۃ کے رخ کو عالم اسلام سے موڑ کر یورپ اور امریکہ کی جانب'' کرنا چاہتا ہے اور اسے ''ماڈرن جمیعۃ'' بنانے کی فکر میں ہے اور دوسرا نظریہ ''جمیعۃ کی قدیم دینی وملی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے'' سمتِ سفر کی تبدیلی کو گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے۔ (۷) اتحاد و ہم آہنگی کی اپیل کرنے والے علماء ذمہ دارانِ جمیعت کی ''دینی حمیت اور ملی غیرت کے ساتھ'' موروثی و خاندانی صفات'' کا حوالہ دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں (۸) جبکہ تاریخ اسلام میں خلافت کی ملوکیت میں منتقلی پر زوردار تقریریں بھی یہی علماء کرتے ہیں۔

اس آمرانہ مزاج نے دینی مدارس کو سخت نقصان پہونچایا۔ قرآن کریم صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کی ممتاز صفت یہ بیان کرتا ہے کہ ﴿وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ﴾ (الشوریٰ: ۳۸)

(اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں)

یہاں قرآن نے شوریٰ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ''فُتیا'' کے وزن پر ہے اور اس کے معنی آپس میں مشورہ کرنے کے ہیں۔ مفسرین کرام نے صراحت کی ہے کہ لفظ اُمر عربی میں اردو لفظ ''معاملہ'' کی طرح بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع ومحل اور سیاق وسباق سے کرتے ہیں۔ آیت زیر بحث کا قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ یہ لفظ جماعتی لفظ کے مفہوم میں آیا ہے یعنی مسلمانوں کا ہر اجتماعی نظم اہل ایمان کے باہمی مشورے پر مبنی ہے اس میں خودسری، انانیت، خاندانی برتری، نسبی غرور کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آیت میں قریش مکہ کے سیاسی و اجتماعی نظم پر زبردست چوٹ بھی ہے کیونکہ اُن کا نظمِ اجتماعی تمام تر خاندانی اور نسبی امتیاز پر قائم تھا۔ اسلام کی مخالفت کا ایک بڑا سبب ان کے لئے یہ بھی تھا کہ وہ اس دعوت کے فروغ پانے کی

صورت میں اپنے اس جاہلی نظام کی موت سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو بشارت دے دی کہ ان کے لئے ایک ہیئت اجتماعی وسیاسی کی شکل میں منظم ہونے کا وقت آگیا اور یہ نظم اجتماعی نسب اور خاندان کی اساس کے بجائے اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہوگا، دوسری طرف قریش کے لیڈروں کو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اب تم خواہ کتنا ہی زور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صرف کرو لیکن انہیں کمزور و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نیا نظام آرہا ہے جو تمہارے اس فاسدانہ نظام کی بساط الٹ کر رکھ دے گا۔ (۹)

یہاں مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے شوریٰ کے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ قرآن عام طور پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا معروف اسلوب یہی ہے مگر سورہ الشوریٰ نے پہلے اقامت صلوٰۃ کا تذکرہ کیا ہے اور پھر شوریٰ کی صفت پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا اصلاحی سوال اٹھاتے ہیں کہ شوریٰ کی اہمیت کا وہ کون سا پہلو ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟

اس سوال کا جواب وہ خود دیتے ہیں کہ اسلام کے نظم اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصل شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لئے ایک بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم وتقویٰ والے کو اپنی امامت کے لئے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدود الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہے، اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابق شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح مسلمانوں کا پورا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے انہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنی

اجتماعی وسیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لئے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحب علم وتقویٰ کو اپنی قیادت کے لئے منتخب کریں۔ اسی طرح تمام معروف میں بے چون و چرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہوجائے جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بلا خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کرکر اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔(۱۰)

نوارا تیز ترمی زن!:

قرآن کریم نے اسلامی اجتماعیت کے لئے باہمی مشاورت کی پابندی پر اس قدر زور دیا ہے مگر تعجب ہے کہ مسلمانوں میں ملوکانہ ذہنیت، زمیندارانہ سوچ اور استبدادی فکر ہی کا سکہ چل رہا ہے اور ہمارے دینی مدارس شوریٰ پر طویل تقریریں کرنے اور اس کے فضائل ومناقب بیان کرنے کے باوجود عملی زندگی میں اس سے بڑی حد تک کنارہ کش ہیں اور اس کے نتیجہ میں ملت اسلامیہ مسلسل جاں گسل صدمات اور آزمائشوں سے گزر رہی ہے۔ جتنی جلد آمریت وانانیت سے پیچھا چھڑالیا جائے اور امت میں جمہوری سوچ، عوامی شراکت اور عام مسلمانوں کی حصہ داری کو تسلیم کرکے اپنے رویہ کی اصلاح کرلی جائے اُتنا ہی بہتر ہے۔

خود احتسابی کی ان سطروں کو پڑھ کر کوئی شخص اگر مایوسی ونامرادی کا شکار ہوجائے اور اصلاح تعمیر امت کی مہم میں حوصلہ کھو بیٹھے تو یہ قرآن کی تعلیمات سے روگردانی بھی ہوگی اور تاریخ اسلامی سے ناآشنائی بھی۔ اسلام انتہائی سخت حالات میں بھی امید کے چراغ روشن رکھنے کا حکم دیتا ہے۔﴿وَلَا تَائیَسُوا مِن رُوحِ اللهِ اِنَّہ لَا یَائیَسُ مِن رُوحِ اللهِ الَّا الْقَومُ الکَافِرُونَ﴾(یوسف۸۷)

(اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اُس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں)

﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الاِنسَانَ مِنَّا رَحْمَۃً ثُمَّ نَزَعْنَاھَا مِنْہُ اِنَّہ لَیَئُوسٌ کَفُورٌ﴾

(ھود:۹)

(اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے)

تاریخ اسلام اپنے دامن میں سینکڑوں ایسے پُر آشوب حالات و واقعات سموئے ہوئے ہے جبکہ امت نے توفیق ایزدی اور فراست ایمان کو سہارے شکست خوردگی اور مریضانہ نفسیات سے دامن جھاڑ کر انگڑائی لی اور احتسابِ نفس کے دشوار گزار مرحلہ کو پار کر کے احتسابِ کائنات کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ دور جدید میں تہذیبِ مغرب کی عسکری، سیاسی اور ثقافتی یلغار کا مردانہ وار مقابلہ یہی مدارس دینیہ اور علماء کرام کر رہے ہیں۔ نائن الیون اور سیون سیون کے امریکہ ولندن میں خودکش دھماکوں کے بعد پورا مغربی میڈیا دینی مدارس کو ملوث و متہم کر رہا ہے اور ہمارے ملک کے زعفران زدہ سیاست داں، اخبارات اور ٹی وی چینلز ان عالمی حادثات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنی سازشوں اور ناپاک منصوبوں کے جال بُننے میں مصروف ہیں مگر قابل مبارکباد ہیں یہ دینی وتہذیبی قلعے اور ان کے محافظ جو ہر تیر آزما کے مقابلہ میں سینہ سپر ہیں۔ ان حالات میں امت مسلمہ حوصلہ مندی، فراست مومنانہ، مستحکم اور دیرپا منصوبہ بندی کے ساتھ دین متین کا دفاع کرے گی اور اس دفاعی مہم میں مدارس دینیہ کا کردار سب سے نمایاں ہوگا۔

xxxxxxxxxxx

حواشی وتعلیقات:

(۱) ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، در دعوت اسلامی۔ (سووینیر سیمینار) مرتب مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، الہند، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۔۳۷۔ فاضل مقالہ نگار نے آخر میں ۱۹۹۶ء کا ایک نصیحت آموز واقعہ درج کیا ہے جو گو کہ ایک قدیم کیتھولک کرسچین کالج کی زیارت کے موقع پر ان کے ساتھ پیش آیا۔ کالج کا اصل مقصد طلبہ کو مشنری کی حیثیت سے تیار کر کے میدان میں اتارنا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ "طالب علم نے مجھے بتایا کہ جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اس سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ آئندہ فقر کی زندگی گزارے گا۔ شادی نہیں کرے گا اور اپنے بڑوں کا احترام اور ان کی اطاعت کرے گا۔ اسے ماہانہ آٹھ سو روپیہ وظیفہ ملتا تھا اور یہ رقم ہندوستان ہی کے بعض مخیر عیسائی سال بھر کا حساب کر کے کالج کو فراہم کرتے تھے۔ تعلیم کے بعد مشنری کی حیثیت سے کام کرنے کیلئے بھی مخیر حضرات طلبہ کی سرپرستی کرتے تھے۔ طالب علم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اس کے کالج کی طرح ملک میں ۳۵ کالج اور ہیں۔"

ایسا ہی ایک واقعہ عالم اسلام کے مشہور داعی و دانش ور ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے کویت کے ایک سیمینار منعقدہ ۱۰ ارشوال ۱۴۲۲ھ/۴ دسمبر ۲۰۰۱ء میں سنایا جسے "منظمة الدعوة الاسلامية" کے اجتماع کمپالا میں فوج کے ایک ریٹائرڈ جنرل نے انھیں بتایا۔ انھوں نے بیان کیا کہ "سوڈان جب آزاد ہوا تو ہم جیپ کے ذریعہ جنوبی سوڈان کے ایک گاؤں میں گئے۔ وہ گاؤں ایسا تھا کہ وہاں کے لوگوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ جب انھوں جیپ دیکھی تو ڈر کر اپنے گھروں میں گھس گئے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ معلوم نہیں کیا چیز ہے جو چلتی ہے جبکہ یہ گائے ہے نہ بھینس۔ خچر ہے نہ گدھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے انھیں جمع کیا اور انھیں سمجھانے لگے کہ ہم بھی تم لوگوں کی طرح سوڈانی ہیں اور تمہارے فائدے کے لئے تمہارے پاس آئے ہیں۔ ابھی ہم ان سے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ گھنٹی کی آواز سنی۔ ہم نے دریافت کیا، یہ گھنٹی کیسی ہے؟ کیا یہ کسی اسکول کی گھنٹی بج رہی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں کوئی اسکول ہے نہ کوئی مکتب اور نہ کوئی شخص پڑھنا لکھنا جانتا ہے۔ ہم نے پوچھا پھر یہ گھنٹی کی آواز کیسی ہے؟ انھوں نے کہا یہ

ہمارے فادر ہیں۔ہم نے کہافادر؟انھوں نے بتایا کہ ایک صاحب ہیں جو ہفتے میں ایک یادو مرتبہ سائکل سے آتے ہیں۔ان کے ساتھ دو تھیلے ہوتے ہیں۔ایک میں بچوں کے لئے مٹھائیاں،ٹافیاں اور دوسرے میں معمولی دوائیں،مرہم،اسپرنس،ڈراپس وغیرہ ہوتی ہیں۔یہ صاحب لوگوں کو مسیح اور عذرا مریم کے بارے میں کچھ بتاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔اسی طرح یہ ہر ہفتے دو مرتبہ آتے ہیں اور اس طریقے سے تقریباً چالیس گاؤں میں جاتے ہیں۔ہم ان صاحب کے پاس گئے وہ ایک پادری تھے۔ہم نے دریافت کیا آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟ کہنے لگے میں بروکسل کا رہنے والا ہوں۔ہم نے پوچھا:اس علاقہ میں کتنے عرصے سے ہیں؟ کہا:تیس سال سے۔ہم نے پوچھا: آپ ان تیس سالوں میں کتنی مرتبہ اپنے گھر والوں کے پاس اور وطن گئے ہیں؟ کہا:ایک مرتبہ بھی نہیں۔دریافت کیا:وطن کب جانے کا ارادہ ہے؟اس نے کہا:ان سوالات کا کیا مطلب ہے۔یہی میرا وطن ہے۔یہیں میرا جینا اور یہیں میرا مرنا ہے۔یہیں میری قبر بنے گی۔میرا پیغام یہیں کے لئے ہے،میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔"

زندگی نو نئی دہلی، جلد ۲۹، شمارہ ۸، اگست ۲۰۰۳ء جمادی الاخریٰ۔رجب المرجب ۱۴۲۴ھ ص ۲۴۔۲۵

(۲) ایک زمانہ میں جب بھارتیہ جنتا پارٹی کی مرکز میں حکومت تھی تو ہندو نیپال کے سرحدی اضلاع میں قائم مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ مہم بڑے شدومد سے چلائی گئی۔پارلیامنٹ کے اجلاس میں جب غلام محمود بنات والا صاحب سے ہوم سیکریٹری سے متعین طور پر ان مدارس کو نامزد کرنے پر اصرار کیا تو انھوں نے گھما پھرا کر بات کرنے کی کوشش کی بالآخر انھیں تسلیم کرنا پڑا کہ ان کی مراد سرحد پار کے مدارس ہیں۔ان مدارس کے خلاف جاری مہم کی تفصیل کے لئے دیکھئے

http:// www.milligazete.com/Archives/1507 2001/06.htm

کنچن گپتا کے الزامات کے صحیح جواب اور بھرپور تجزیہ کے لئے دیکھئے:

Zafarul Islam Khan: Madarasahs lies, dams lies, the Milli Gazette, 134-135, vol. 6 No. 16-17,16 Aug- 16, Sep.2005. P.8

نیز اسی شمارہ میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب کا دوسرا تنقیدی مضمون ص ۹ پر ملاحظہ کیجئے، عنوان ہے:

Tawleen Singh, Salvos: barking at the wrong tree.

یہ تنقیدی تبصرہ محترمہ تولین سنگھ کے اس جارحانہ مضمون کے جواب میں ہے جو انڈین ایکسپریس ۲۴ر جولائی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا

Madrasas can only breed fanatics

(مدارس صرف جنونی افراد ہی پیدا کرتے ہیں!)

(۳) مولانا مفتی محمد شفیعؒ، وحدت امت، رحمٰن پبلشرز، گلی قاسم جان، دہلی، ص ۱۸۔۲۰

(۴) نفس مصدر، ص ۵۱

(۵) اس دھینگا مشتی کی تفصیل جو اخبارات میں چشم دید گواہوں نے پیش کی ہے، بڑی شرمناک ہے، محمد نور اللہ جاوید قاسمی راشٹریہ سہارا ۱۱ر مارچ ۲۰۰۶ء کے مراسلات کالم میں لکھتے ہیں:
''جمیعت کے بہی خواہ تجربہ کار حضرات نے (صدارت کے لئے) مولانا ارشد مدنی کا نام پیش کیا اور کچھ نوجوان جو جمیعت کی اور روایت و تاریخ سے بھی نابلد تھے، انہوں نے مولانا محمود مدنی کا نام پیش ہی نہیں کیا بلکہ ہنگامہ بازی کر کے جمیعۃ علماء کی شاندار تاریخ پر ایک بدنما دھبہ لگا کر داغدار کر دیا۔ میں خود مجلس منتظمہ کے اجلاس میں موجود تھا کہ جب تاریخ و روایت کو پامال کیا جا رہا تھا اس وقت اکابرین جمیعۃ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ مشکل سے امیر الہند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن، مولانا عبد الرزاق بھوپالی، مولانا ازہر رانچی، قاری عثمان دیوبند، مولانا عبد الحق دیوبند اور حضرت مولانا ارشد مدنی کو بچا کر ہنگامہ سے نکالا گیا اور اس طرح یہ اجلاس ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔''

(۶) چنانچہ راشٹریہ سہارا ۱۰ر مارچ ۲۰۰۰ء کے اخبار میں جمیعت علماء ہند کے پانچ صوبوں کے پچاس اراکین مجلس منتظمہ نے ایک اشتہار شائع کرایا اور موجودہ انتخاب کو غیر دستوری و غیر جمہوری قرار دیتے ہوئے انتخاب نو کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح کا مطالبہ ۱۲ر مارچ کے اخبار میں تین سو سے زائد اراکین منتظمہ کے دستخط سے شائع ہوا۔ اور آخر میں ۱۴ر مارچ کے اخبار میں جمیعت کے

ناظم عمومی کے نام دوبارہ انتخاب کرانے کی سرکاری وقانونی نوٹس بھی بطور اشتہار شائع ہوگئی۔

(۷) دیکھئے خادم دارالافتاء وناظم تعلیمات جامعہ معین الاسلام نوح میوات، مفتی زاہد حسین قاسمی کا خط، راشٹریہ سہارا ۲۲/ مارچ ۲۰۰۶ء

(۸) دیکھئے راشٹریہ سہارا ۲۲/ مارچ ۲۰۰۶ء کے صفحہ اول پر شائع شدہ "ہدیہ تہنیت" منجانب مولانا امام الدین، مہتمم مدرسہ دارالعلوم مالکیہ، رام نگر، نینی تال، صدر جمیعۃ علماء اترانچل، اس اپیل میں یداللہ علی الجماعۃ کا حوالہ بھی ہے اور اَلوَلَدُ صِنوٌ لِأبیہ (لڑکا زیادہ تر اپنے والد کا مثل ہوتا ہے) کا بھی۔

(۹) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، جلد ششم، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، نومبر ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۹

(۱۰) نفس مصدر، ص ۱۷۹۔۱۸۰

xxxxxxxxxxxxxxxxx

منتخب کتابیات:

[۱] احمد نذر، (حافظ)، جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۲ء

[۲] ادارہ علوم القرآن، قرآنی مقالات، (ماہنامہ الاصلاح کے منتخب قرآنی مضامین) ، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

[۳] اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۲ء جلد نہم

[۴] ارشد، محمد، عربی زبان وادب کے ارتقا میں مدرسۃ الاصلاح کی خدمات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ڈاکٹریٹ، زیر نگرانی ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء

[۵] اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، جلد ششم، ۱۹۷۸ء، جلد اول، دہلی ۱۹۸۹ء

[۶] شذرات، در ماہنامہ الاصلاح (اداریہ) سرائے میر اعظم گڑھ، اگست ۱۹۳۶ء

[۷] اصلاحی، شرف الدین (ڈاکٹر)، ذکر فراہی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، ۲۰۰۱ء

[۸] اصلاحی، عبدالرحمٰن پرواز خلیل الرحمٰن میرا بھائی، در ماہنامہ شاعر بمبئی کا خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر، بمبئی، مکتبہ قصر ادب، جلد ۵۱، شمارہ ۶۔۴، ۱۹۸۰ء

[۹] اصلاحی، محمد عمر اسلم، مدرسۃ الاصلاح۔ تعلیمی تحریک وفکری پس منظر، ماہنامہ رفیق منزل نئی دہلی کا مسلم تعلیمی تحریکات وشخصیات نمبر، ج ۱۰، شمارہ ۵۔۶، مئی۔جون، ۱۹۹۷ء

[۱۰] اصلاحی، صدر الدین، تلخیص تفہیم القرآن، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، بار دوم، ۱۹۸۵ء

[۱۱] اصلاحی، عبدالعظیم (ڈاکٹر) قرآنی معیشت کے بعض بنیادی مسائل، در ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ج ۶، شمارہ ۱۔۲، جنوری۔دسمبر ۱۹۹۱ء

[۱۲] الٰہی، محمد عاشق، تذکرۃ الرشید، سہارن پور، ناظم کتب خانہ اشاعت العلوم، ۱۹۷۷ء

[۱۳] بریلوی، احمد رضا خان، حسام الحرمین، لاہور، ۱۹۷۵ء

[۱۴] حیات الموات، لاہور

[۱۵] تعمیر حیات، خصوصی شمارہ، ۱۹۸۰ء

[۱۶] جماعت اسلامی شعبہ تنظیم، روداد جماعت اسلامی ہند، اگست ۱۹۴۸ء، جولائی ۱۹۹۶ء

[۱۷] حامد، رضیہ (ڈاکٹر) اور سلطان، رفعت (مرتبہ) نقوش بھوپال، بھوپال، باب العلم پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

[۱۸] حسنی، بلال عبدالحئی، سوانح مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

[۱۹] الحسنی، سید محمد، روداد چمن، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

[۲۰] سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ لکھنؤ ۱۹۶۴ء

[۲۱] خان، بابو فرید اور خان بابو، عبدالحئی، بلریا گنج کا بابو خاندان۔ شجرۂ نسب اور مختصر تاریخ، ادارہ مظہر دین، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء

[۲۲] خان، سر سید احمد، تفسیر القرآن وھوالھدیٰ والفرقان، لاہور، رفاہ عام پریس، لاہور، جلد اول

[۲۳] خان، شمس تبریز (مولوی) تاریخ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، حصہ دوم، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء

[۲۴] خان، محمد حسان (ڈاکٹر)، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال۔ ایک تعارف، بھوپال، اشاعت ہشتم، ۲۰۰۲ء

[۲۵] خان، مفتی احمد یار، جاء الحق وزھق الباطل، لاہور

[۲۶] دستور العمل مدرسۃ الاصلاح، حمیدیہ پریس، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۶۷ء

[۲۷] دلیل دار العلوم الأشرفیہ، بمبارکفور، مبارک پور، اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء

[۲۸] دہلوی، احمد، تاریخ اہل حدیث لاہور، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۳ء

[۲۹] دہلوی، شاہ عبدالعزیز، فتاویٰ عزیزی، دہلی، ۱۳۱۱ھ

[۳۰] دہلوی، میاں نذیر حسین محدث، معیار الحق، دہلی، مکتبہ نذیریہ، ۱۹۶۵ء

[۳۱] روئداد، ندوۃ العلماء، سال اول

[۳۲] رفیع، محمد، دارالعلوم دیوبند کی سیرت اور اس کی مختصر تاریخ، دہلی، ۱۹۱۶ء

[۳۳] روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی (مختلف شمارے)

[۳۴] رضوی، ظفر الدین (مولانا)، حیات اعلیٰ حضرت، کراچی، ۱۹۳۸ء
[۳۵] زندگی نو (فضل الرحمٰن فریدی، مدیر) ج ۲۹، شمارہ ۸، اگست ۲۰۰۳ء/ جمادی الاخریٰ۔ رجب ۱۴۲۴ھ
[۳۶] سلفی، اصغر علی امام مہدی وفلاحی، خالد حنیف صدیقی (مرتبین)، یادگار مجلہ اہل حدیث (پاکوڑ اہل حدیث کانفرنس کے موقع پر شائع شدہ دستاویز) دہلی، مکتبہ ترجمان، ۲۰۰۴ء
[۳۷] سلفی، رفیق احمد رئیس (مرتب)، علوم الحدیث۔ مطالعہ و تعارف (مجموعہ مقالات سیمینار منعقدہ ۱۸۔ ۱۹/ اکتوبر ۱۹۹۸ء) علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
[۳۸] تبصرہ بر ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' دوماہی الصفا، جلد اول، شمارہ ۵، ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء
[۳۹] سلفی، محمد مستقیم، جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات، بنارس، جامعہ سلفیہ، اشاعت دوم ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء۔ اشاعت اول جامعہ سلفیہ بنارس کی دعوت و تعلیم کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۰ء کے موقع پر
[۴۰] شعبہ نشر واشاعت، جامعۃ الفلاح (اردو اور عربی میں تعمیری منصوبوں کا یکجا تعارف)، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ
[۴۱] جامعۃ الفلاح۔ اغراض و مقاصد (مطبوعہ تعارفی فولڈر) جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، سن طباعت غالباً ۱۹۹۴ء
[۴۲] شفیع، مفتی محمد، وحدت امت، رحمٰن پبلشرز، گلی قاسم جان دہلی
[۴۳] شیروانی، حبیب الرحمٰن خان (مولانا) استاذ العلماء یعنی حضرت مفتی لطف اللہؒ کی مختصر سوانح عمری، علی گڑھ، شیروانی پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۷ء
[۴۴] ظلی، اشتیاق احمد (ڈاکٹر)، فراہی سیمینار، اداریہ درششماہی علوم القرآن علی گڑھ، ج ۶، شمارہ ۱۔۲، جنوری۔ دسمبر ۱۹۹۱ء
[۴۵] عبدالرحمٰن، منشی، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ملتان
[۴۶] عزیز، عارف، مساجد بھوپال، بھوپال، اقرا پبلشنگ ہاؤس، اشاعت ثانی، نومبر ۲۰۰۳ء
[۴۷] فراہی، حمید الدین، تفسیر نظام القرآن (اردو ترجمہ: امین احسن اصلاحی)، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء

[۴۸] فلاحی، عبید اللہ فہد (ڈاکٹر) تاریخ دعوت و جہاد۔ برصغیر کے تناظر میں، لاہور، معارف اسلامی، طباعت سوم، ۲۰۰۰ء

[۴۹] مولانا فراہی کی تفسیر نظام القرآن کا ایک مطالعہ، درششماہی علوم القرآن علی گڑھ، ج ۶، شمارہ ۱۔۲، جنوری۔ دسمبر

[۵۰] قاسمی، محمد طیب، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، دیوبند، ۱۹۶۸ء

[۵۱] کاظمی، احمد سعید، تسکین الخواطر، ملتان

[۵۲] گنوری، فضل الرحمٰن، تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

[۵۳] گنگوہی، رشید احمد، فتاویٰ رشیدیہ، مرادآباد، ۱۹۰۶ء

[۵۴] گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی، لاہور، ۱۹۶۹ء

[۵۵] قادری، غلام حسین (مرتب) فتاویٰ اہل السنۃ، کان پور

[۵۶] قاسمی، انوارالحسن، انوار قاسمی، دیوبند، ۱۹۵۸ء

[۵۷] لکھنوی، عبدالحئی، دہلی اور اس کے اطراف لکھنؤ، ۱۹۵۸ء

[۵۸] مجلس انتظامیہ انجمن (مرتبہ)، روئداد جلسۂ چہارم انجمن اصلاح المسلمین اعظم گڑھ منعقدہ ۲۲۔۲۴ مئی ۱۹۰۸ء، مطبع ماہتاب، اعظم گڑھ ۱۹۰۸ء

[۵۹] مجلۃ الجامعۃ السلفیہ کا مؤتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر، بنارس، جامعہ سلفیہ، (دعوت و تعلیم کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۰ء کی تفصیلی رپورٹ)، بنارس، ۱۹۸۱ء

[۶۰] مدنی، انیس احمد فلاحی (مرتب)، دعوت اسلامی (سووینیر سیمنار منعقدہ ۲۵۔۲۷ فروری ۲۰۰۵ء)، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء

[۶۱] تحقیق سے تحریف تک، حیات نو بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء

[۶۲] مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر، انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح کا سالانہ مجلہ، شمارہ ۹، ۱۹۹۶ء

[۶۳] مصباحی، محمد احمد، (مولانا)، حدوث الفتن وجہاد أعیان السنن، مطبوعہ مع المعتقد المنتقد للعلامۃ فضل الرسول القادری، مع شرحہ المسمی المستند المعتمد بناء نجاۃ الأبد للعلامۃ احمد رضا القادری البریلوی، ممبئی، رضا اکیڈمی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

[۶۴] مظفرالدین، حیات اعلیٰ حضرت، کراچی، ۱۹۵۵ء

[۶۵] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ستمبر ۱۹۸۲ء

[۶۶] نانوتوی، محمد قاسم، تصفیۃ العقائد، کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۷۶ء

[۶۷] مباحثہ شاہجہاں پور، دیوبند

[۶۸] ندوی، سید سلیمان، یادرفتگاں، کراچی، ۱۹۵۵ء

[۶۹] حیات شبلی، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۳۰ء

[۷۰] ندوی، محمد رضی الاسلام (ڈاکٹر)، تفسیر تیسیر القرآن۔ایک مطالعہ، در ''مولانا صدرالدین اصلاحی۔حیات وخدمات'' مجلہ حیات نو بلریا گنج، اعظم گڑھ کا خاص نمبر، مرتب مولانا عبدالبر اثری فلاحی، ج ۱۶، شمارہ ۱۔۴، رمضان۔ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ/جنوری۔اپریل ۲۰۰۰ء

[۷۱] ندوی، مسعودالرحمٰن خان، حیات عمران، جلداول، بھوپال، ۱۹۹۵ء

[۷۲] ندوی، سید ابوالحسن علی، کاروانِ زندگی، لکھنؤ، جلد دوم، ۱۹۸۳ء

[۷۳] ندوی، محمد اسحٰق جلیس، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول، لکھنؤ، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

[۷۴] ندوی، محمد رئیس، دیوبندی تحفظ سنت کانفرنس پر سلفی تحقیقی جائزہ، مہاراشٹرا، مرکز الدعوۃ الاسلامیۃ والخیریۃ، رتنا گیری، جولائی ۲۰۰۴ء

[75] http://www.milligazette.com/Archieves/1507,2001/06htm

[76] District Gazetteers of the United Provinces of Agra and Oudh, Vol.33 (Azamgarh), 1911, Vol.44 (U.P.)

[77] Esposito, John L., The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World, Oxford,. 1995.

[78] Masud, Muhammad Khalid, Trends in the Interpretation of Islamic law as reflected in the Fatwa literatute of Deoband School, A study of the attitudes of the Ulama of Deoband to certain Social problems and Invention, M.A. Thesis. Istitute of Islamic Studies Mc.Gill University, 1969.

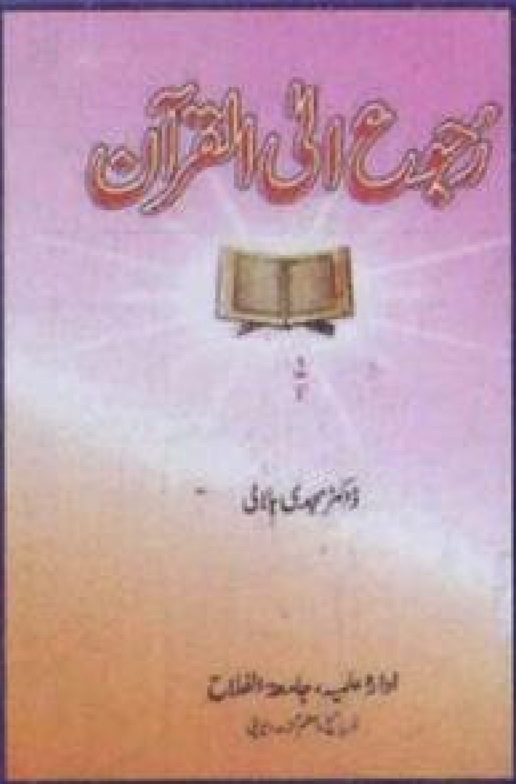
[79] Metcalf, Barbara, Daly, Islamic Revival in British India, Deoband, 1860-1900, Princeton,1982.

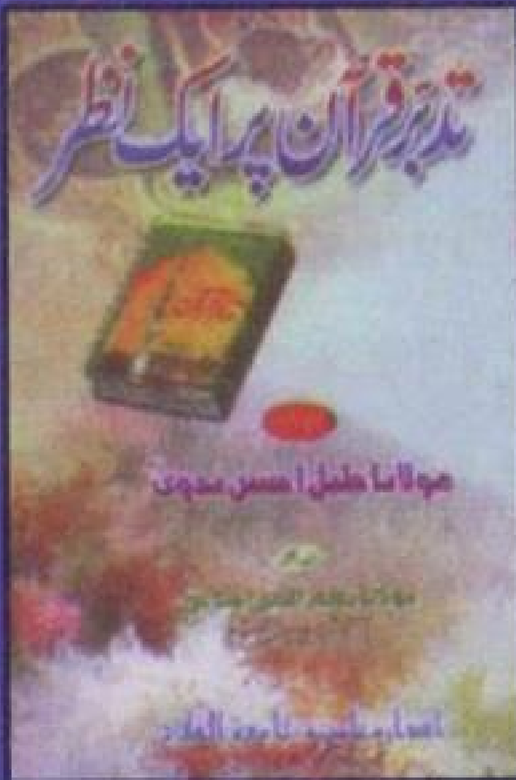
[80] Powell, A.A. Maulana Rahmat Allah Kairanwi and Muslim- Christian Controversy in India in the mid 19th Century, Journal of the Royal Asiatic Society, 1976.

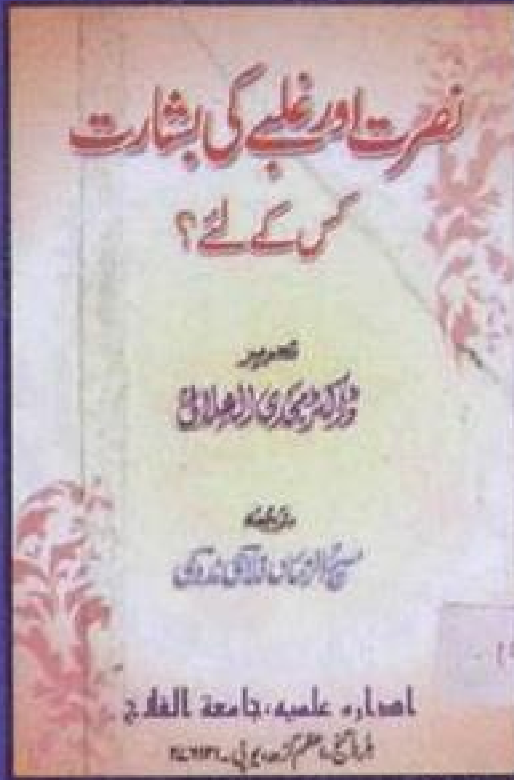
[81] Teli, Ghulam Nabi, Jamiatul Falah in the Historical and Educational Perspective, Unpublished Ph.d Thesis submitted in the Department Of Islamic Studies A.M.U. Aligarh under the supervision of Dr.Obaidullah Fahad in 2003.

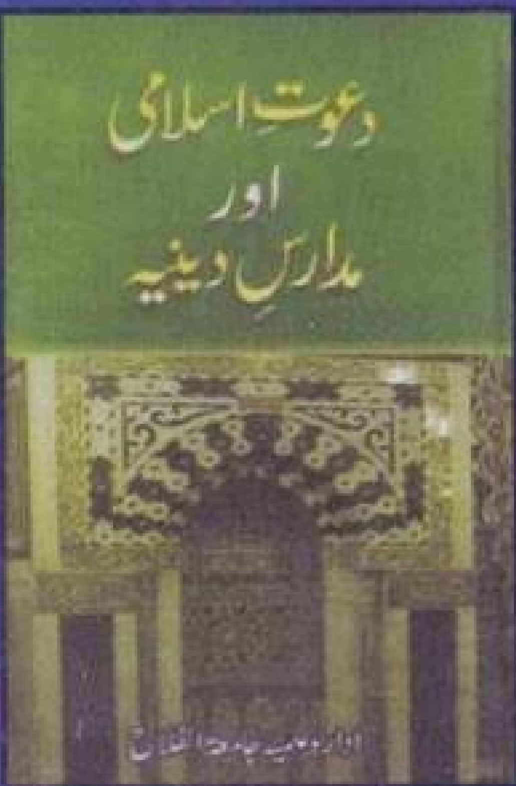
[82] The Encyclopedia of District Gazetteers of India , Vol.6.

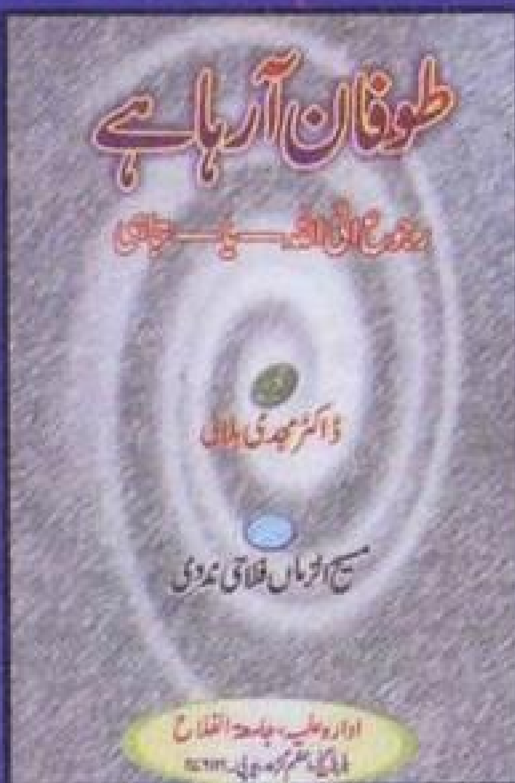
xxxxxxxxxxxx

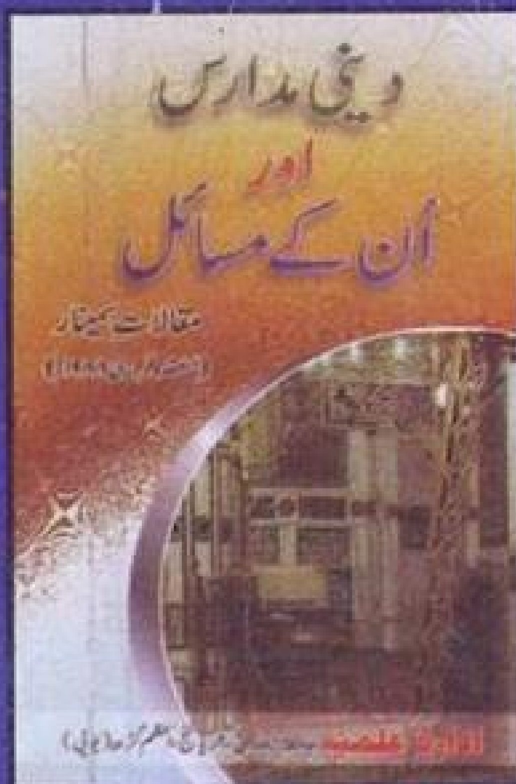


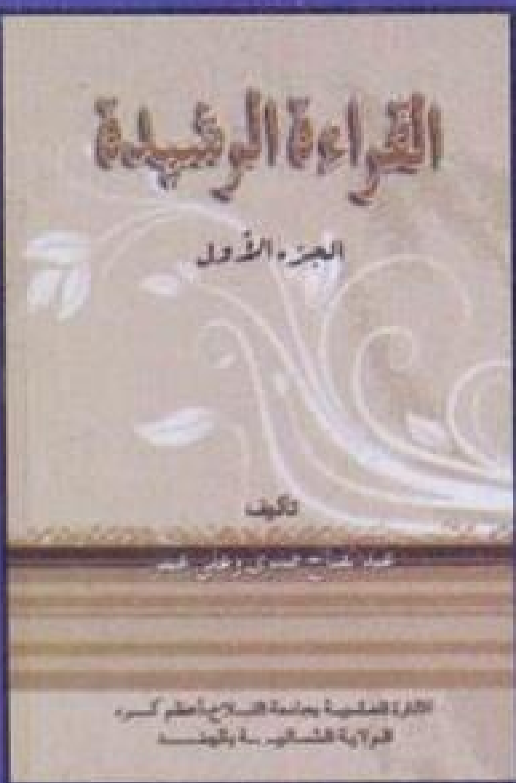


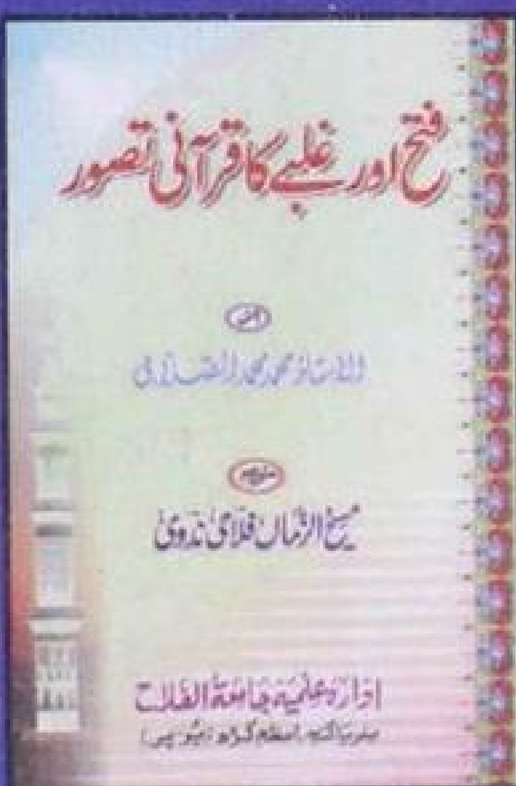


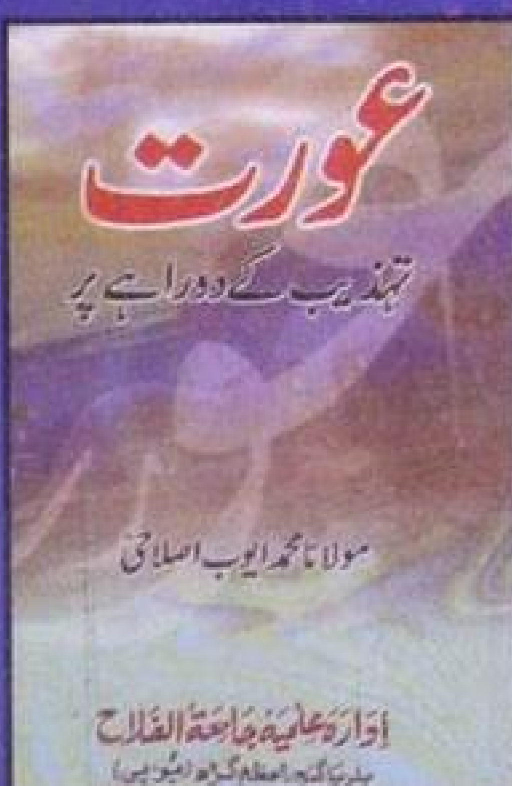












IDARA-E-ILMIA, JAMIATUL FALAH

BILARYA GANJ, AZAMGARH-276121 (U.P.)